محمد بختیار حسن
ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

احسن نمبر	ستمبر ۱۹۴۱ء	جلد ۱۹

طلباء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

مجلسِ انتظامی

نگراں:- مولوی ضیاء احمد صاحب - ایم اے - بدایونی - (لکچرار شعبۂ فارسی)

منیجر:- شیخ عطاء اللہ صاحب - ایم اے - لکچرار شعبۂ اقتصادیات

مدیر:- اختیار حسن - ایم اے ایل - ایل - بی - (علیگ)

نائب مدیر:- سید محمد صادق صاحب صفوی

اراکین :-

(۱) ناظر الحق صاحب فرشوری۔ بی۔اے (آنرس) (علیگ)

(۲) ایم اے وحید صاحب۔

(۳) اطہر حسن صاحب۔

(۴) مصباح الحسن صاحب۔

(۵) مس تاج بیگم۔ ایم اے۔

فہرست مضامین

جلد ۱۹ | ستمبر ۱۹۴۱ء | احسن نمبر

شذرات

علی گڑھ میگزین کے اس شمارہ کا انتساب مولانا احسن صاحب احسنؔ مارہروی مرحوم کے نام سے کیا جا رہا ہے۔ یوں تو ہمارے یہاں پیر پرستی، قبر پرستی، وغیرہ سب کچھ ہے لیکن ہم نے ابھی اسلاف پرستی، کو سمجھا بھی نہیں ہے۔ یہ ہماری قوم کی بدنصیبی نہیں تو کیا ہے کہ اس کے مشاہیر مرتے ہی گمنامی اور فراموشی کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک درخشاں ستارے کی طرح جو دور آسمان میں چمک رہا ہو ہمارے لئے شمع ہدایت بن سکتی ہے۔ ان کی جد و جہد، ان کی کامیابی اور ناکامیوں کی داستانیں اس رزم گاہ حیات میں ہماری رہبر ہو سکتی ہیں لیکن یہاں تو بقول اقبال۔

ع قافلہ بے حس ہے آواز درا ہو یا نہ ہو

یہی جذبات ہیں جنہیں دل میں لیکر علی گڑھ مولانا مرحوم کی یاد کو اپنا خراج عقیدت پیش کر رہا ہے۔

مولانا اُن لوگوں میں تھے جنکے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی موت ایک فرد واحد کی موت

نہیں ہوتی بلکہ پوری جماعت یا قوم کی موت ہے۔ وہ ان افراد میں تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں ملک و قوم کی خدمت کے لئے وقف کردی تھیں جن حضرات کو مولانا سے ملنے اور انہیں برتنے کا موقع ملا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مولانا کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا یعنی زبان شعر اور ادب کی خدمت، خدمت جس طرح جس قدر اور جس وقت بھی ہو سکے، بحیثیت شاعر انہوں نے قدیم غزلگوئی کے رنگ کو جس جدّت اسلوب سے نباہا اس میں داغ کے فیض صحبت کے پہلو بہ پہلو خود ان کے مذاق سلیم کو کافی دخل ہے۔ زبان کی تحقیق اور تفتیش کے سلسلہ میں انہوں نے جس کاوش اور محنت سے اُردو زبان سے اپنی محبت اور اس کی خدمت کے شوق کا ثبوت دیا وہ ان کی وسعت نظر اور عمق مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کے خلوص کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے کبھی نہ اپنی شاعری اور نہ تحقیق کو "پیشہ" بن کر تجارتی اصولوں پر چلایا بلکہ اس قسم کے ادبی گداگروں سے انھیں سخت نفرت تھی اور اس کے اظہار میں وہ بے باک بھی تھے۔

علی گڑھ سے ان کا تعلق برسوں قایم رہا۔ پہلے انٹرمیڈیٹ کالج میں اور پھر یونیورسٹی میں استاد شعبۂ اُردو کی حیثیت سے عرصہ تک وہ ہم سے وابستہ رہے اور اپنے متعلقہ فرائض کو جس خوبی دیانت داری اور محنت سے انجام دیا آج بھی اسکی یاد ہمیں بار بار حال سے کشاں کشاں ماضی کی طرف لیجاتی ہے۔ وہ تھے تو استاد لیکن طالب علمی کی پوری شان جو ایک محقق اور فاضل میں پائی جاتی ہے ان میں موجود تھی ایک ایک لفظ کی تحقیق اور تصحیح کے لئے وہ دنوں تک حوالہ جات اور لغات کی ورق گردانی کرتے تھے۔ کوئی اچھا مضمون یاد آتا تو برسوں کے پرانے رسالوں کے فایل اس ذوق و شوق سے دیکھتے گویا کہیں کوئی دفینہ معلوم ہوگیا ہے اور اب اسے برآمد کرنے کی فکر ہے۔ ایک ایک حوالہ کی تلاش میں اس قدر محنت کرتے کہ خود ان کے طالب علم گھبرا جاتے لیکن ظاہر ہے کہ اس مشقت سے حاصل کیا ہوا "گوہر" بھی "نادر" ہی ہوتا،

چنانچہ ان کی تمام تحقیقی تصانیف اس پر شاہد عادل ہیں۔

سن و سال کے تفاوت کے باوجود طالب علموں سے درجہ سے باہر بھی دوستانہ تعلقات رکھتے ایک طور پر یہ علی گڑھ میں ایک قابل قدر رواج ہے جس کی مثال شاید ہی کسی دوسری درسگاہ میں مل سکے کہ یہاں استاد اور شاگرد میں وہ اجنبیت نہیں پائی جاتی جو صحیح اکتساب علم میں مانع آتی ہے۔ مولانا کے دولت کدہ پر اکثر شام کے وقت اور تعطیل کے زمانہ میں، دوسرے اوقات پر ان کے شاگردوں کا ہجوم رہتا تھا علمی مذاق کی باتیں ہوتیں، شعر و شاعری کا ذکر، تنقید اور تبصرہ اور اس کے ساتھ ہی مولانا کی مہمان نوازی شامل ہو کر ان صحبتوں کو اور بھی جاذب اور پرلطف بنا دیتی تھی۔

مولانا اپنی وضع کے بڑے پابند تھے اور قدیم آداب کی پاسداری جو ہماری مشرقی تہذیب میں شرافت و نجابت کا معیار سمجھی جاتی تھی اس کے لحاظ سے مولانا کا "شمار باقیات الصالحات" میں تھا، جن کے بزرگوں سے کبھی شناسائی ہو جاتی ان کے بچوں اور قرابت داروں سے کمال محبت اور شفقت سے پیش آتے، ہر ایک کی مدد کرتے اور دوسروں سے کرا دیتے۔ فراخدلی اور عالی ظرفی سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔ جس سے ملتے خندہ پیشانی سے۔ مغموم اور کبیدہ خاطر لوگ بھی ان کے پاس بیٹھ کر اٹھتے تو بشاش اور شگفتہ۔ غرض مولانا اپنے نامور بزرگوں کی صحیح یادگار تھے۔

علی گڑھ سے ان کو اور علی گڑھ کو ان سے محبت تھی۔ مدت ملازمت کے اختتام پر کئی مرتبہ ان کی میعاد ملازمت میں توسیع کی گئی اور جب آخری وقت وہ رخصت ہوئے تو جس قدر رقت ان سے جدا ہونے والوں پر طاری تھی اتنے ہی وہ خود بھی متاثر معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد بھی اپنے صاحبزادہ کے قیام علی گڑھ کے باعث ان کا تعلق علی گڑھ سے قائم رہا اور جب کبھی آتے اپنے ہم جلیسوں اور طالب علموں سے اسی محبت اور خلوص سے ملتے جو ان کی عادت تھی۔ وفات کے بعد ایک ادیب اور محقق کا جو اثاثہ نکل سکتا تھا۔

وہ بھی اپنے اسی پرانے مرکز قومی کو بخش گیا یعنی ان کا قیمتی اور نادر کتب خانہ ان کی خواہش کے مطابق مسلم یونیورسٹی لائبریری میں منتقل کر دیا گیا۔

باوجود اپنی قدامت پرستی اور وضع اسلاف کی پابندی کے وہ تنگ نظری، تعصب اور غیر ضروری ضد اور ہٹ دھرمی سے کوسوں دور تھے۔ علوم قدیمہ تو ان کے گھر کی چیز تھے۔ لیکن اقتضائے زمانہ کے مطابق انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم جدید طرز پر روا رکھی اور اس میں پوری سعی کی چنانچہ مولانا کے لائق اور ہونہار صاحبزادے سید محمد احسن صاحب اپنے خاندان میں پہلے گریجویٹ ہیں۔ اسی طرح ان کے اور صاحبزادوں نے بھی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کر کے ان کے اور اپنے خاندان کے نام کو روشن کیا ہے۔

مولانا ہم سے رخصت ہوگئے لیکن ان کی یاد ہمیشہ قایم رہے گی اور ان کے علمی اور تحقیقی کارنامے شمع ہدایت بن کر ان کے نام کو روشن رکھیں گے۔

کورٹ کے اجلاس میں جو یونیورسٹی کے گزشتہ سشن کے اختتام پر منعقد ہوا تھا جناب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب کثرت رائے سے وائس چانسلر مقرر ہوئے، ہم اس انتخاب پر ڈاکٹر صاحب کو میگزین کی طرف سے ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی اعلیٰ علمی و تعلیمی قابلیت، ممتاز ملکی اور قومی جذبات یونیورسٹی سے گہری دلچسپی اور واقفیت اور ضرب المثل ہمدردی اور خلوص تعارف سے مستغنی ہے۔ ہمیں کامل امید ہے کہ ہماری درسگاہ علمی ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں انشاءاللہ بیش از بیش ترقی کریگی۔

خیال تھا کہ جنگ کے موجودہ حالات اور ملک میں ہر چیز کی گرانی کا اثر امسال کے داخلوں پر ضرور پڑے گا۔ لیکن خلاف امید اس مرتبہ اس کثرت سے داخلے ہوئے کہ تمام دارالاقامے اپنی گنجائش سے بہت زیادہ معمور ہوگئے۔ آخر بہت سی کوٹھیوں کو عارضی طور پر طلباء کے لئے مخصوص کر کے دارالاقامے قائم کرتے پڑے داخلوں کی اس قدر کثرت

تھی کہ ہمارے ہردلعزیز پروائس چانسلر صاحب کو دن کے اوقات مقررہ کے علاوہ کئی روز مغرب تک مصروف رہنا پڑا تاکہ اُن طلباء کو جو باہر سے داخلہ کی غرض سے آئے تھے۔ تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔ اس کے باوجود بھی یہ سلسلہ مقررہ تواریخ کے علاوہ کئی روز تک جاری رہا۔

علی گڑھ کی کشش میں اس سے اور بھی اضافہ ہو گیا ہے کہ گذشتہ چند سال سے ملک کی اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلہ میں اس یونیورسٹی کے طالب علم دوسری درسگاہوں کے نمائندوں کی نسبت زیادہ کامیاب ہو رہے ہیں ہم اس پر ارباب یونیورسٹی کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔

آنریبل نواب صاحب چھتاری جو ہمارے یہاں کے پرانے طالب علم، کورٹ اور یونیورسٹی کی دوسری مجلسوں کے ایک ممتاز رکن ہیں۔ حیدرآباد میں وزیراعظم کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے ہیں، ہم اعلیٰ حضرت بندگان عالی فرمانروائے حیدرآباد و برار و چانسلر مسلم یونیورسٹی کے شکرگذار ہیں کہ اعلیٰ حضرت نے ہماری جامعہ کے ایک نامور فرزند کو یہ ذمہ دار عہدہ عطا فرماکر علی گڑھ اور حکومت حیدرآباد کے تعلقات کو مزید استواری بخشی۔ ہم نواب صاحب ممدوح کو بھی ان کے اس انتخاب پر جس کے وہ بہرنوع مستحق تھے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ابھی کچھ دن ہوئے ہمارے ٹریننگ کالج کی ایجوکیشن سوسائٹی کا ایک وفد کشمیر گیا اور اس وفد نے "کل ہند تعلیمی کانفرنس" میں شرکت کی جو ان دنوں وہاں منعقد ہوئی تھی۔ ٹریننگ کالج کے پرنسپل صدیقی صاحب ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اس پروگرام کو نہ صرف ترتیب ہی دیا بلکہ ہر ہر قدم پر اپنی شرکت سے اسے پوری طرح کامیاب

بھی بنایا۔ ہمیں امید ہے کہ صدیقی صاحب اپنے وسیع تجربہ سے علی گڑھ کے ٹریننگ کالج کی شہرت اور نیکنامی میں اور اضافہ کریں گے۔ کشمیر کے دورہ کے سلسلہ میں محمد حسن خانصاحب سکریٹری ایجوکیشن سوسائٹی کا انتظام بھی قابل تعریف رہا۔

اب چند باتیں میگزین کے متعلق بھی عرض کرنا ضروری ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ گزشتہ سال چند در چند وجوہ سے میگزین شائع نہ ہوسکا اور یہ شمارہ بھی اس قدر تاخیر سے شائع ہورہا ہے۔ جس کے لئے۔ ہم ناظرین سے معذرت خواہ ہیں، ہم آیندہ کوشش کریں گے کہ پابندیٔ وقت سے میگزین شائع کرکے اس کی تلافی کریں۔

اس سلسلہ میں ہم ایک مرتبہ پھر ارباب حل وعقد یونیورسٹی کی توجہ آفتاب ہال کے مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ آفتاب ہال کے طلبہ علی گڑھ میگزین کے چندہ سے مستثنیٰ اور اس لئے قدرۃً میگزین سے محروم ہیں۔ ہمارے خیال میں ۲/ مہینہ کی حقیر رقم میگزین کی خاطر گراں نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ تعداد بھی ہمارے میگزین کے خریداروں میں شامل ہوجائے تو میگزین کی مالی اساس استوار اور اُس کا حلقۂ تعاون وسیع تر ہوجائے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے پرو وائس چانسلر صاحب اور پرووسٹ صاحب آفتاب ہال جلد اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

میگزین کی پالیسی میں ہمارے دورادارت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک علمی درسگاہ کا رسالہ ہے اور اسے اتنا ہی وقیع اور سنجیدہ ہونا چاہیئے۔ جیساکہ اسکی حیثیت کا اقتضا ہے۔ اور چونکہ یہ ادارہ خود ایک اسلامی ادارہ ہے اس لئے میگزین کو بھی اسلام اور اسلام کی روایات کا احترام مدنظر رہنا چاہیئے۔ مضامین کے انتخاب اور اشاعت میں بھی ہم ان ہی اصولوں پر کاربند ہوں گے اور اس سلسلہ میں۔ ہمارے انتہائی

سعی یہ ہوگی کہ میگزین کا دامن اُن جدید تحریکات سے جو اپنی سقاہت۔ مذہب سے بغاوت پست مذاقی اور بداخلاقی کے لئے بدنام ہیں آلودہ نہ ہو۔

یادِ رفتگاں

فروغِ شمع جواب ہے رہیگا رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

یہ سال اردو شاعری اور ادب کے حق میں نہایت نامبارک ثابت ہوا اور یکے بعد دیگرے ایسی ہستیاں فنا سے ہم آغوش ہوگئیں جن کی کمی ہم عرصہ تک محسوس کرتے رہیں گے۔

قمر بدایونی

یکم رجون ۱۹۴۱ء کو جناب قمر بدایونی نے وفات پائی۔ میگزین میں "لمعات قمر" کے عنوان سے آپ کا کلام بارہا چھپا ہے اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں بھی جناب قمر نے اپنا کلام اکثر سنایا ہے۔ آجکل جب کہ شاعری محض تفنن طبع کا ذریعہ ہے اور ہر شخص تک بندی کرکے محفلوں کو اپنی "پاٹ دار آواز" اور "بجتے ہوئے ساز" سے مسحور کرسکتا ہے کسی ایسے شاعر کا قبول عام پانا جو پرانے مسلک کا پیرو ہو اور شاعری کو فن سمجھ کر اختیار کرے دشوار ہے، لیکن اس دشواری کو جس کمال اور صنّاعی سے قمر صاحب نے دور کیا وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے سیدھے سادے اشعار جن میں زبان کا لطف، دلکش تراکیب، اور چست بندشیں جگہ جگہ جلوہ فگن ہوتیں سننے والوں کے دلوں میں تیز نشتر کی طرح اترتے چلے جاتے۔ قمر صاحب غزل گو

تھے اور "ظرفِ تنگنائے غزل نہایت محدود سمجھا جاتا ہے لیکن متقدمین کی خوبی کے ساتھ جدت کا اضافہ کرکے قمرؔ صاحب نے غزل کے دامن کو اس سے وسیع تر کر دکھایا جتنا اب تک سمجھا جاتا تھا۔ قمرؔ صاحب شاعر ہی نہ تھے بلکہ مضمون نگار اور ناقد بھی تھے، انکے مضامین بلند پایہ رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ مرحوم بہت سی تصانیف اور مجموعہ کلام چھوڑ گئے ہیں جو ان کی زندگی میں طبع نہ ہو سکے۔ مرحوم کا ایک مضمون اس میگزین میں شائع ہو رہا ہے جو انھوں نے انتقال سے کچھ قبل ہمکو مرحمت فرمایا تھا۔

افسوس کہ ان کے انتقال سے بدایوں کے مردم خیز خطے میں ایک بڑی کمی ہوگئی۔ رب العزت ان پر اپنے الطاف کی بارشیں کرے۔

عظیم بیگ چغتائی

عظیم بیگ چغتائی کے انتقال کی اطلاع ایسے وقت ملی جب ہم اس کے لئے تیار بھی نہ تھے۔ عظیم بیگ کی تصانیف میں قہقہوں کا سیلاب اتنا امڈا ہوا تھا کہ اس پردہ میں سوز کی آواز سنائی بھی نہ دیتی تھی۔ طنز اور مزاحیہ نگاری میں اردو ابتک کم مایہ ہے۔ عظیم بیگ سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ تھیں لیکن۔

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہمیں مرحوم کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ہے خدا مرحوم کی تربت کو عنبریں کرے۔

فانی بدایونی

ستمبر ۱۹۴۱ء میں ایک غیر فانی فانیؔ ہم سے رخصت ہوا۔ حضرت غالب اور میر کی آخری یادگار تھی جو ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئی۔ فانیؔ ہماری تنقید یا تعریف کی منزل

سے بہت آگے تھے زمانہ گزرتا جائے گا اور ان کا کلام دور سے ان کی زندگی کے سوز و ساز کی ان کے مخصوص رنگ کی ساحری میں آمیزش کرکے پکارتا رہے گا۔

کیوں اہل حشر ہے کوئی نقاد سوز دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

خداوند کریم انھیں جنت الفردوس میں ابدی سکون و راحت بخشے۔

ان حضرات کا شکریہ نہ ادا کرنا ناانصافی ہوگی جنھوں نے "احسن نمبر" کی تیاری میں ہماری مدد کی۔ سب سے پہلے جناب سید محمد احسن صاحب خلف حضرت احسن مرحوم و جناب سید انطاف احمد صاحب داماد۔ حضرت مرحوم ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے مولانا کے متعلق مضامین فراہم کرنے میں ہماری اعانت کی اور فوٹو و بلاک مرحمت فرمائے۔ جناب صغیر احسنی صاحب نے بھی کافی مدد کی۔ ہم ان سب حضرات کے ممنون ہیں۔

مولانا الحاج حافظ سید شاہ علی احسن صاحب مرحوم

ولادت سنہ ۱۲۹۳ ہجری / سنہ ۱۸۷۶ عیسوی

وفات سنہ ۱۳۵۹ ہجری / سنہ ۱۹۴۰ عیسوی

قطعاتِ تاریخ وفات مولانا احسن مرحوم

جناب صدیق حسن صاحب صدّیق دہلوی

کیف زا نغمے تھے گویا سحر تھا آواز میں　　شاعرِ شیریں سخن کیا عندلیبِ باغ تھا
کردیا خاموش لیکن آج اسکو موت نے
آہ جو احسن جہاں میں یادگارِ داغ تھا
۱۹۴۰

آج ہے ماتم جہاں میں یادگارِ داغ کا　　سینۂ اردو سے غم کا کیوں نہ پیکاں پار ہو
کیا لکھوں اس کے سوا صدیق اب میں سالِ غم
مرقدِ احسن پہ نازل۔ رحمتِ غفّار ہو
۱۹۴۰

کل تو تھا احسن جہاں میں رونقِ باغِ سخن　　زینتِ خلدِ بریں ہے آج تو اے محترم
تیری رحلت کی لکھی تاریخ یہ صدیق نے
لے گیا صبر و سکوں تو۔ دے گیا ہے رنج و غم
۱۳۵۹

از جناب خان صاحب علی احمد صاحب جعفری۔ سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن دہلی

انڈریل روڈ۔ سول لائن۔ ۲۱ رجون ۱۹۴۱ء

دہلی

مکرمی ایڈیٹر صاحب علی گڑھ میگزین۔ وعلیکم السلام۔ یہ معلوم ہو کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے میگزین کی عنانِ ادارت ہاتھ میں لیتے ہی ایک فرض خاص کی جانب توجہ کی اور آپ احسن نمبر کے نام سے میگزین کا ایک خاص نمبر بہت جلد شائع کرنے والے ہیں، جو ملک کے نامور ادیب و شاعر حضرت احسن مارہروی کی ایک بہترین ادبی یادگار ہوگا۔ اس حیثیت سے کہ مولانائے مرحوم میگزین کے ایک دیرینہ سرپرست تھے اس پر مولانا کا یہ ایک حق ہے، جس کو آپ کی سعادتمندی بوجہ احسن ادا کر رہی ہے۔ جزاک اللہ فی الدارین خیر۔
میں نہ تو ادیب ہوں اور نہ شاعر۔ اس واسطے میرے لئے یہ "چھوٹا منہ اور بڑی بات" کا مصداق ہوگا کہ میں مولانائے مرحوم کی ادبی خدمات اور خصوصیات پر تبصرہ کروں مگر ہاں مرحوم کے بیشمار عقیدت مندوں میں سے ایک ادنیٰ عقیدتمند ہونے کی حیثیت سے مجھ کو بھی حق حاصل ہونا چاہیئے کہ مرحوم کے مزار پر اپنی عقیدت کے پھول چڑھاؤں۔ لہٰذا مندرجہ ذیل چند سطور پیش ہیں :-

حضرت مولانا حاجی حرمین الشریفین، سید، شاہ، علی احسن، احسن مارہروی، سجادہ نشین خانقاہِ مارہرہ شریف و لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہندوستان کے وہ تمام حضرات جو ادبیات سے ذرا سا بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ آپ کے نامِ نامی سے بخوبی واقف ہوں گے کیونکہ خوش مذاق رسائل ادبیہ میں سے کوئی بدنصیب ہی رسالہ ہوگا جس نے مولانا کے رشحاتِ قلم سے استفاضہ نہ کیا ہو۔

مولانا احسن مارہرہ کے اُس مشہور و معروف خاندانِ صوفیا کے جانشین تھے جس کے دروازے پر سارا ہندوستان سرِ نیاز مندی جھکاتا تھا اور جو ادبیت کے اس پائے کا

حامل تھا کہ حضرت غالب کو بھی وہاں کی آستان بوسی کا ذوق ہمیشہ دامنگیر رہا۔

آپ نے مدت مدید تک حیدرآباد میں اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی صحبت میں حاضر رہ کر موصوف کے سلسلۂ اصلاحات کلام تلامذہ کی پیشکاری کی خدمات انجام دی تھیں اور آپ حضرت داغ کے بہت ہی محبوب شاگرد اور ممتاز جانشین تھے۔ اس ماحول نے مولانائے مرحوم کو اعلیٰ درجہ کا نقاد، بہترین اصلاح کار، حاضر جواب، بذلہ سنج، پرگو شاعر اور انشا پرداز بنا دیا تھا۔ تاریخ گوئی۔ عروض دانی اور سخن سنجی کے وہ جوہر پیدا کر دئے تھے کہ اپنے عہد میں وہ ایک نمایاں شخصیت کے حامل رہے۔ مولانا احسن صرف یہی نہیں کہ اعلیٰ درجہ کے شاعر اور انشا پرداز ہوں بلکہ خوش نویس بھی تھے۔ رمل میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، فن کشتی کے ماہر تھے، عابد و زاہد تھے، متقی و پرہیزگار تھے۔ بچّوں میں بچّے تھے اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے، متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ غرض بزرگانِ قدیم کی طرح جامع کمالات ظاہری و باطنی تھے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آپ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ غزل قصیدہ غرض ہر صنف کلام پر مرحوم نے یکساں قدرت کے ساتھ قلمرانی کی۔ آپ کا کلام صفائی، روانی، روزمرّہ کی خوبی اور محاورہ بندی غرض داغ اسکول کے تمام اوصاف سے متّصف ہے، آپ کے مضامینِ نثر نہایت شگفتہ ہیں اور اکثر ہندوستانِ ماضی کے مرقعے۔ آپ کی تصنیفات یوں تو متعدد کتابیں ہیں مگر تاریخ ادبِ اردو، جس میں آپ نے اردو زبان اور اس کے اسالیبِ بیان کے ارتقا پر نمونے دے دے کر تبصرہ کیا ہے، ایک بہت ہی بیش قیمت اور قابل قدر کتاب ہے۔

میرے وطن بدایوں سے مولانا اور ان کے خاندان کو جو قریبی واسطہ رہا ہے اسکی بنا پر مرحوم کے ساتھ میری عقیدتمندی کا رشتہ اور بھی راسخ ہو جاتا ہے۔ اپنی علی گڑھ کی تعیناتی کے زمانے میں مجھ کو اکثر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے

ان کو ہمیشہ ہشاش بشاش اور علمی مشاغل میں مصروف پایا۔ آپ کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پرلطف ہوتی تھی۔ خلوص اور جوش آپ کے ہر لفظ سے ٹپکتا تھا۔ انتہا کے وضعدار تھے۔

ہمارے نوجوانوں کو جو بیشتر تھوڑا ہی سا پڑھ لکھ کر خدا جانے خود کو کیا سے کیا سمجھنے لگتے ہیں، مولانا کی تقلید کرنی چاہیئے کہ مرحوم باوجود مجمع کمالات ہونے کے ہمیشہ انانیت سے مبرّا رہے۔ اسی کے ساتھ مولانا کی زندگی سے علم و ادب کی خدمت میں لگے رہنے کا سبق بھی لینا چاہیئے۔ آئیے۔ آپ ہم آپ سب مل کر دعا کریں کہ خداوند کریم حضرت احسن کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے تلامذہ کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہماری موجودہ اور آیندہ نسلوں میں مولانا کی قسم کے ہزارہا نمونے پیدا کرے۔ والسلام۔

خاکسار

علی احمد جعفری

حضرت شاہ میاں جناب احسن مرحوم کی یاد میں

جناب منشی قمرالحسن صاحب قمر بدایونی (مرحوم)[۱]

مرحوم سیّد تھے۔ حافظ قرآن تھے۔ باشرع اور پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ مارہرہ شریف کی چھوٹی سرکار کے صاحب سجّادہ تھے (لیکن رُشد وہدایت کی ذمّہ داری سے بہت گھبراتے تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے شاید ہی کسی کو مرید کیا ہو) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لکچرار تھے۔ وجیہہ وخوش پوشاک تھے۔ خلیق ومتواضع تھے۔ محب ومخلص تھے۔ خلوص ومحبت کے قدردان تھے۔ متین وخوددار لیکن خوش مزاج تھے۔ قابل وباخبر ادیب تھے۔ محتاط وماہرفن شاعر تھے۔ جہاں استاد فصیح الملک مرزا داغؔ مرحوم ومغفور کے مخصوص وممتاز شاگرد تھے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ شاعری کے شوق کا یہ عالم تھا کہ کسبِ کمال کی دُھن میں وطن کو خیرباد کہکر مدتوں حیدرآباد میں رہے اور اس قدر یکسوئی کے ساتھ استاد سے فیض حاصل کیا کہ دورانِ قیام میں کوئی دوسری فکر یا غرض اصل مقصد میں مخل نہو سکی۔ فنّی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں جو مسلسل اور ٹھوس خدمت رسالۂ فصیح الملک کے ذریعہ سے انجام دی اس نے سینکڑوں کی آنکھیں کھول دیں اور ہزاروں کو شاعر بنا دیا۔ اس پر خوبی یہ کہ سوائے ادبی خدمت کے اس رسالے کو ذاتی شہرت ومنفعت یا خودنمائی وخودستائی کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا اور بے جا طرفداری یا تعصب سے کبھی کام نہیں لیا۔ مگر افسوس کہ باوجود اس سلامت روی اور بے لاگ مفید خدمت انجام دینے کے مالی نفع حاصل ہونا تو درکنار رسالے کی آمدنی سے اس کا خرچ بھی پورا نہ ہو سکا۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں مرحوم کی ذاتی مالی حالت کو اس سے کافی نقصان پہونچا۔ فصیح الملک بند ہو جانے کے بعد بھی مرحوم نے سلسلہ تصنیف وتالیف کو جاری رکھا اور ادبی خدمت مختلف رسالوں کے ذریعہ سے آخر تک انجام دیتے

---

[۱] قمر صاحب مرحوم نے یہ مضمون سال گزشتہ لکھا تھا۔ افسوس کہ امسال اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔

رہے۔ مخصوص شعر و ادب سے متعلق آپ کا کتب خانہ بھی ایک قابلِ قدر یادگار ہے۔

یہ تو یاد نہیں کہ مجھے شاعر کی حیثیت سے مرحوم کی پہلی ملاقات کا شرف کب اور کہاں حاصل ہوا لیکن یہ خوب یاد ہے کہ مرحوم شروع سے آخر تک مجھ پر مہربان ہی رہے۔ اور کسی موقعہ پر بھی اپنے خواجہ تاش بھائیوں سے کم نہ سمجھا۔ مرحوم کی جو توجہ میرے حال پر تھی سب سے پہلے اس کا اظہار بدایوں کے ایک بڑے مشاعرے میں ہوا۔ اس مشاعرے میں جب میں غزل پڑھ چکا تو مرحوم نے اسی زمین میں فی البدیہ یہ مصرعہ فرمایا ع اک چیز ہے اس بزم معانی میں قمر بھی۔

رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ جس مشاعرے میں بھی تشریف لے جاتے تھے مجھے ضرور پوچھتے تھے اور جہاں کہیں دیکھ لیتے تھے بہت خوش ہوتے تھے کچھ تو اس وجہ سے کہ قدرتی طور پر حلیم الطبع اور عالی ظرف تھے اور کچھ اس بنا پر کہ بدمزاج اور خود نمانہ تھے مشاعروں کی معمولی فروگذاشتوں کو خود ہی نظر انداز کر دیتے تھے یا شاذ و نادر کبھی آزردہ خاطر یا بددل ہو بھی جاتے تھے تو یہ اثر وقتی ہوتا تھا اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ وسیع تعلقات یا مجبور کن اصرار کے مقابلے میں اس کو قایم نہ رکھ سکتے تھے۔ جب کبھی شاعروں کی اس کمزوری کا ذکر آجاتا تھا تو اس کی وجہ عجیب عجیب مثالوں سے سمجھاتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ غصّے کے وقت شاعروں کا یہ عہد ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ وضع حمل کے وقت عورتوں کا۔

چنانچہ مارچ ۱۹۳۴ء میں ڈبائی ضلع بلند شہر اور مین پوری کا سالانہ مشاعرہ ایسی تاریخوں میں پڑا کہ ہر ایسے شخص کو جو مشاعرے کے آخر نمبروں پر غزل پڑھتا ہو دونوں جگہ شریک ہونا بہت مشکل تھا۔ ڈبائی کا مشاعرہ اگرچہ دو روز کا تھا لیکن پہلے روز باوجود اصرار کے مجھے اور مرحوم کو غزلیں پڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ بدقت تمام دوسرے روز فہرست غزل خوانی کی ترتیب کے خلاف اپنا نمبر آنے سے پہلے ہم نے اپنی غزلیں پڑھیں اور جما ہوا مشاعرہ چھوڑ کر اور اہل مشاعرہ سے معافی مانگ کر فوراً ہی مین پوری کو روانہ ہوگئے۔ ادھر تو نا وقت

سفر کرنے کی وجہ سے غیر معمولی تکلیف برداشت کرنی پڑی ادھر جب خدا خدا کرکے مین پوری پہنچے
تو ریلوے کی خود مختارانہ اداؤں کے مطابق گاڑی اسٹیشن سے تقریباً ایک فرلانگ ادھر روک
دی گئی۔ اس پر طرّہ یہ کہ خلاف معمول و خلاف امید مجلس استقبالیہ کی طرف سے کوئی شخص اسٹیشن
پر نہیں آیا اور تیسری سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ اسٹیشن پر صرف ایک قلی موجود تھا
اس کو بھی مین پوری کے اسسٹنٹ سرجن صاحب نے ہم سے پہلے پکار لیا مگر خیریت یہ ہوئی کہ
صاحب موصوف ہم لوگوں سے واقف تھے اور انھیں یہ معلوم تھا کہ ہم ان کے ضلع کی نمائش
کے مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے آئے ہیں انھوں نے ہماری پریشانی کو دیکھ کر اپنی شرافت
و معقولیت سے ہمیں اطمینان دلایا کہ ان کے اسباب سے پہلے قلی ہمارا اسباب تانگوں تک
پہونچا دے گا اور ایسا ہی ہوا لیکن وہاں پہونچکر دیکھا تو مشاعرے کی طرف سے کسی مخصوص
سواری کے موجود ہونے کا تو کوئی موقع ہی نہ تھا کرایہ کے تانگوں میں سے بھی جن تانگوں کو
منتخب کیا جا سکتا تھا ان پر ہم سے پہلے پہونچنے والے قبضہ کر چکے تھے۔ اتفاق سے ایک صاحب
مین پوری کے ساکن جو ہمارے متعارف تھے ہمیں دیکھ کر اپنے تانگے میں سے اتر پڑے اور اس
پر ہمیں سوار کرا دیا مگر ان سے زیادہ بات چیت نہ ہو سکی جس سے آنے والی مصیبتوں کا پتہ چل
جاتا۔ تانگے کا گھوڑا اپنی جگہ سے دو ہی چار قدم آگے بڑھا ہوگا کہ مرحوم کی تانگے سے کچھ باہر کو
نکلی ہوئی چھڑی دوسرے تانگے سے الجھکر کچھ اس ڈھب سے ٹوٹی کہ مرحوم کی اچکن میں بھی کھونتا
لگا۔ اور خفیف سی خراش جسم پر بھی آئی۔ اس ناگہانی تصادم سے نجات پاکر اپنی مستقل قیام گاہ
یعنی اصغر صاحب مہتمم مشاعرہ کے مکان پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ وہ مشاعرے میں ہیں۔ پوچھا مشاعرہ
کہاں ہے تو جواب ملا کہ نمائش میں یعنی شہر سے تقریباً دو تین میل کے فاصلے پر۔ یہ سنکر رہے
سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آتی تھی کہ آج آنے والی رات کو ہونیوالا
مشاعرہ دن میں کیسے ہو گیا مگر سوچنے سے کیا ہوتا تھا مجبوراً نمائش کا رُخ کیا نصف سے زاید
مسافت طے ہونے کے بعد نمائش سے واپس آنے والوں کی زبانی معلوم ہوا کہ مشاعرہ ختم ہو چکا۔

یہ سنکر مرحوم کی زبان سے بے ساختہ نکلا" انا للّٰہ وانا الیہ راجعون" اسی موقعہ پر میں نے اپنے لڑکے ارشدی سے پوچھا کہ مشاعروں میں شریک ہونے کے شوق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کیا اس کے بعد بھی کسی مشاعرے کی شرکت کا ارادہ کروگے تو آپ نے ہنسکر فرمایا کہ پہلے تو خود توبہ کر و اس کے بعد مجھ سے کہو آخر میں اس بیچارے سے کیا کہتا۔

اس واقعہ کا ذکر مقصود تو یہیں تک تھا لیکن اس کو اپنی جگہ پر مکمل کرنے کے لئے مختصراً یہ بھی لکھ دوں کہ سانحاتِ سفر کا پریشان کن سلسلہ یہاں تک پہونچنے کے بعد اصغر صاحب مشاعرے سے واپس آتے ہوئے مل گئے اور اپنے مکان پر لے آئے۔ اب ہم تو اصغر صاحب سے یہ پوچھتے ہیں کہ اس وقت مشاعرہ کیسا اور وہ ہم سے پوچھتے ہیں۔آپ کی تشریف آوری اس وقت کیسی۔ آخر فیصلہ اس غلط فہمی پر ہوا کہ ہم لوگوں کو تاریخ تو یاد رہی اور وقت اس شاعرانہ ضرب المثل کے ماتحت کہ برے کاموں کے لئے اللّٰہ میاں نے رات ہی بنائی ہے مشاعرہ دن میں ہونا ہی نہیں چاہیئے یا تو دیکھا ہی نہیں اور یا خیال میں نہیں رہا۔ المختصر رات کو بزم مشاعرہ اصغر صاحب کے مکان پر از سر نو منعقد ہوئی۔ اس طریقے سے ہم نے کرایہ کی وصول کردہ رقم ادا کی یا اس طرح ہم سے کرایہ وصول کیا گیا۔

اس خود رائی اور خود مختاری سے قبل جب کسی شاعر کو اپنی غلطی کے متعلق یہ لکھنے کا مجاز نہ تھا کہ میں اس غلطی کو جائز سمجھتا ہوں۔ اساتذہ یہ کوشش نہیں کرتے تھے کہ اپنے رنگ کی روشنی پھیلانے کے لئے دنیا بھر کے چراغ گل کر دیں یا صرف اپنا سکہ چلانے کے لئے دنیائے شاعری کی ساری ٹکسالیں بند کرا دیں۔ بزرگوں اور اساتذہ کے فیض صحبت کو سعادت اور حصول قابلیت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور علمی وفنی تحقیق و تدقیق کبھی نہ ختم ہونے والی چیز خیال کی جاتی تھی جب دور دور کے شاعر کسی جگہ جمع ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک طبقہ مشاعرے سے بچا ہوا وقت محض سیر و تفریح میں گذارتا تھا۔ ایک گروہ صرف کلام سننے اور سنانے میں معروف رہتا تھا اور ایک جماعت کا شغل سننے سنانے سے بھی زیادہ کتابوں کی تلاش آپس

کے علمی مباحث اور فنّی تبادلہ خیال پر منحصر ہوتا تھا مرحوم بھی اسی آخری جماعت میں شامل تھے۔
مرحوم کے کلام کو اگر جمع کیا جائے تو کافی ضخامت کے کئی دیوان مرتب ہو سکتے ہیں۔
لیکن جب کبھی اس کا ذکر آیا یہی کہکر ٹال دیا کہ ابھی اتنا دیوانہ نہیں ہوا ہوں اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ یا تو وہ کلام کو جمع کرنے۔ ترتیب دینے۔ انتخاب کرنے اور چھپوانے کی طوالت سے گھبراتے تھے اور یا کلام کی اشاعت جو رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ سے ہوتی رہتی تھی اسی کو کافی سمجھتے تھے بہرحال اس کا ارمان یا ارادہ کبھی نہیں کیا۔
نیک نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب کسی مشاعرے کے صدر ہوئے اپنوں سے زیادہ غیروں کا خیال کیا یہاں تک کہ ان کی اس خصوصیت سے تنگ آکر میری موجودگی میں کئی بار دلیرؔ صاحب مارہروی کو اُن کے اختیارات صدارت کے خلاف سول نافرمانی کرنی پڑی اور مشاعرے کی داد کاشیاب دیکھ کر اس سے قبل کہ اُن کا نام پکارا جائے باختیار خود غزل پڑھنے کو چلے گئے۔ مرحوم کی اس عادت کا احساس ان کے دوسرے دوستوں کو بھی ہوتا تھا مگر یہ دلیری دلیرؔ صاحب ہی کے حصے میں آئی تھی۔
مرحوم کے سلسلۂ حالات میں یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ مخصوص مباحث کے علاوہ عام اختلافی مسائل میں اثر لینے کا جذبہ تو تھا مگر طبیعت میں ضد نہ تھی کسی بحث کو چھیڑ کر اس کو انتہا تک پہونچانے کے درپے نہیں ہوتے تھے جو لکھ دیا لکھ دیا اور جب تک چاہا اس کو جاری رکھا۔
ایک مرتبہ کسی فرمائش پر میرا ایک مضمون غلط الفاظ کی تصحیح کے عنوان سے "پیمانہ" میں شائع ہوا تھا اس کو مرحوم نے رسالہ الہلال اٹاوہ اپریل ۱۹۲۵ء میں فعل عبث قرار دیتے ہوئے میری کوشش سے اختلاف کیا اور بڑی شد و مد سے اختلاف کیا لیکن میری نیازمندی اور اپنی عنایت و محبت کو جس حد تک ملحوظ رکھا اُس کا اندازہ ان فقروں سے ہو سکتا ہے "میں قمر کی خوش گوئی سے بے حد محظوظ ہوتا ہوں اور بغیر کسی رو رعایت کے کہنا چاہتا ہوں کہ ایشیائی مذاقِ تغزّل کو جن محاکات و جذبات کے ساتھ جس سادگی سے وہ ادا کرتے ہیں ان کے معاصرین

میں کم از کم میری نگاہ کے سامنے دوسرا نہیں۔ میرے عزیز ترین دوست... قمر بدایونی نے جس خطائے اجتہادی کو عطائے ثواب کی امید میں مشتہر کیا ہے وہ کسی روش سے راہ صواب نہیں بن سکتی۔ چونکہ فی الحقیقت راقم کو ان کے ساتھ مخلصانہ خصوصیت ہے اس لئے اس صدمہ کو (جو اس مضمون سے ہوا) زیادہ برداشت نہ کر سکا ایسی صورت میں اگر پیمانۂ صبر چھلک گیا تو زیادہ سے زیادہ میری خطائے اضطراری سمجھ لی جائے۔ یہ مراسلہ و مکالمہ خدا نخواستہ مکابرہ و مناقشہ نہیں بلکہ محض تحقیق فن ہے.... میں اپنے عزیز دوست کے اجتہاد کی تردید بار خاطر بنکر نہیں بلکہ یار شاطر کی صورت میں کرنی چاہتا ہوں" اسی قسم کے اور فقرے بھی ہیں جنکو بلحاظ طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔ آخر میں ایک جگہ یہ بھی لکھ دیا کہ ہمارے عزیز دوست سے یقیناً کسی غیر معروف اثر کی وجہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔ میں نے ان کے اس مضمون کا جواب بھی لکھا جو شائد معراج الکلام امروہہ میں شائع ہوا لیکن مرحوم نے پھر یہ سلسلہ جاری نہیں رکھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد اسی موضوع پر ایک کتاب شائع ہوئی تو اس پر آپ کا مقدمہ موجود تھا جب مجھ سے ملاقات ہوئی اور میں نے اس فعل عبث کی تائید میں مقدمہ لکھنے کی وجہ پوچھی تو ہنسکر فرمایا کہ بعض کام انسان کو مروت سے بھی کرنے پڑتے ہیں لیکن غیور ہونے کی حیثیت سے جس بات پر اڑ جاتے تھے اس سے کبھی نہیں ہٹتے تھے اور اپنی شان کے خلاف ہرگز کسی بات کو روا نہیں رکھ سکتے تھے۔

رنگ کلام کے اعتبار سے مرحوم کا کلام قدیم رنگ تغزّل کا آئینہ دار ہے جس پر ذوق مرحوم کی تقلید کا اثر غالب ہے مگر چونکہ قادر الکلام شاعر تھے ہر رنگ کا شعر لکھتے تھے۔ اس دعوے کے ثبوت میں اس قسم کے بہت سے اشعار نقل کئے جاسکتے ہیں ؎

بلحاظ جذبات واثر ؎

اس چشم نیم باز کو ہنگام نزع دیکھ	پردے میں جس کے آرزوئے ناتمام ہو
آغازِ سوزِ الفت تھا شمع کی زباں پر	انجام عشق خاک پروانہ کہہ رہی ہے
" ہو ذکرِ غم کسی کا میں یہ سمجھ رہا ہوں	دنیا مجھی سے میرا فسانہ کہہ رہی ہے

شیوۂ ضبط نے آہوں کی اجازت بھی نہ دی — دل کا دل ہی میں رہا درد بھی پیدا ہو کر

بلحاظ معنی آفرینی وحسن ادا
شاہد ہیں تیری بے ذہنی پر خموشیاں — یہ بات اگر نہیں ہے تو ہاں کچھ کلام ہو

تمہارے جاں نثاروں میں تمہیں کیا اک نرالے ہیں — یہ جتنے جی رہے ہیں سب تمہیں پر مرنے والے ہیں

" قاصد نئی ادا سے ادائے پیام ہو — مطلب یہ ہے کہ بات نہ ہو اور کلام ہو

" تکبیر پڑھ کے کشتۂ غم کو حلال کر — موت اس کی زندگی کی طرح کیوں حرام ہو

بلحاظ شوخی ورنگینی
کیا دل ہو خوش کہ ہے وہ جفا جو زمیں سے دور — تم کیسے آسمان کے قائم مقام نہ ہو

سبوئے مے اُسے لاکر دیا وضو کے لئے — گناہ ہم نے کیا شیخ کو ثواب ہوا

" احسن وہ سن کے شکوۂ تشہیر کہہ گئے — ہم جانتے ہیں تم کو بڑے نیک نام ہو

" دیکھا نہ ہم نے روزنِ در سے تمہیں تو کیا — باز آئیں گے فرشتے بھی کیا آسمان پر

بلحاظ اخلاق وتصوف
مجاز بنکے حقیقت سے آشنا ہوں میں — نہ خود نما مجھے سمجھو خدا نما ہوں میں

" پتا نہیں مجھے پیدا کیا ہے کیوں احسن — خبر ہے جس کی مقدر وہ ابتدا ہوں میں

" جہانِ بے ثبات اک مستقل غم خانہ ہے احسن — یہاں آوازِ نغمہ بھی فغاں معلوم ہوتی ہے

لیکن کسی ضخیم کلام میں سے ایسا انتخاب پیش کر دینا نہایت معمولی بات ہے لہٰذا میں اس موقعہ پر مرحوم کی ایک ہی غزل کے اشعار نقل کرتا ہوں۔ جو اتفاق سے اس وقت میرے سامنے ہے اور جس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسی غرض سے تصنیف کی گئی ہوگی یا مرحوم کے سارے کلام میں اپنی قسم کی بھی ایک غزل ہے۔ اس کو دیکھکر یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ان پندرہ اشعار میں بھی قریب قریب ہر رنگ کا شعر موجود ہے ؎

ساقی و واعظ میں ضد ہے بادہ کش چکر میں ہے — توبہ لب پر اور لب ڈوبا ہوا ساغر میں ہے

روک لے اے ضبط جو آنسو کہ چشم تر میں ہے — کچھ نہیں بگڑا ہے اب تک گھر کی دولت گھر میں ہے

کون ایسا ہے یہ کس کی خو دلِ مضطر میں ہے — چین سے دنیا ہے یہ بے چین اپنے گھر میں ہے

ہمکو اپنی سخت جانی پر بھروسا کچھ نہیں — تو بتا سفاک دم کتنا ترے خنجر میں ہے

اپنے دیوانوں سے پوچھیں آپ حُسنِ سادگی ۔۔۔ ہے بناوٹ ہی بناوٹ اور کیا زیور میں ہے
غم کو پالا ہے تو خونِ دل پلائیں کیوں نہ ہم ۔۔۔ اس میں کیا حجت کرے کوئی جو حاضر گھر میں ہے
دب گیا تھا میرے مرنے سے جو اِک محشر خرام ۔۔۔ کیا وہی خوابیدہ فتنہ صورتِ محشر میں ہے
تیرے وعدوں کے تلوّن نے تری کھو دی ہے ساکھ ۔۔۔ کیا بھروسا ہو کہ دم بھر میں نہیں دم بھر میں ہے
دل کے مٹ جانے سے جوشِ عشق گھٹ سکتا ہے کیا ۔۔۔ دل سے کیا مطلب کہ یہ سودا تو میرے سر میں ہے
جوشِ غم سے ہے یہ عالم چشم دریا بار کا ۔۔۔ رات دن بے فصل کی برسات میرے گھر میں ہے
زار اتنا ہے ترا عاشق کہ دھوکے میں ہیں سب ۔۔۔ یہ کوئی بیمارِ غم ہے یا شکن بستر میں ہے
نازِ بے جا بھی جو کرتا ہے تو کرتا ہے بجا ۔۔۔ دل کا پھر کیا پوچھنا جب پہلوئے دلبر میں ہے
سب کھٹکتے ہیں صفِ مژگاں سے تیری چشمِ یار ۔۔۔ اک نہ اک دل چھیدنے والا اسی لشکر میں ہے
مانتا ہے آستاں کو تیرے کعبہ اور کون ۔۔۔ یہ ہمارا ہی نشانِ سجدہ سنگِ در میں ہے

احسنِ آوارہ قسمت کی نہ پوچھو گردشیں ،
اپنے گھر بیٹھا ہوا تقدیر کے چکر میں ہے

"انوارِ قمر" (فرخ آباد) اپریل سنہ ۱۹۱۳ء

الغرض مرحوم ایسی مسلّم شخصیت کے مالک اور ایسی خوبیوں کا مجسمہ تھے کہ اعزہ واحباب اور نیاز مند و عقیدت مند تو درکنار شناسا و متعارف بھی جیتے جی تک مرحوم کو نہیں بھول سکتے اور مرحوم کے ادبی کارنامے ہمیشہ ہمیشہ دنیائے ادب میں یادگار رہیں گے۔ خدا مرحوم کو فردوس بریں کی نعمتوں سے نوازے۔ آمین

مرحوم کا ادنیٰ ترین نیاز مند
خاکسار
قمر

غزل

جو اگست ۱۹۰۳ء

قیام حیدرآباد میں کہی

مرسلہ کنور مشکور حسین صاحب رئیس ہنڈو

بزمِ دشمن میں وہ ہیں انمیں ہمارا دل ہے — ہائے لیلیٰ ہے کہیں اور کہیں محمل ہے

کیجئے جس کا تصور وہی آتا ہے نظر — میرے سینہ میں یہ دل ہے کہ بھری محفل ہے

کیا یوں ہی وعدۂ وصل آپ کرینگے ایفا — پردۂ شرم و حیا بیچ میں کیوں حائل ہے

جس قدر آپ کے وعدے ہیں وہ سب سچے ہیں — اور جو میری شکایت ہے وہ سب باطل ہے

غیر کے باب میں کیا آپ سے تکرار کریں — نہ کوئی اسکا نتیجہ ہے نہ کچھ حاصل ہے

آدمی دستِ قضا سے نہ بچا ہے نہ بچے — بچ گیا آج اگر کوئی تو کل مشکل ہے

ناخوشی طبع کی ظاہر ہے غزل سے احسن

مگر اندیشۂ آزردگیِ سائلؔ[۱] ہے

[۱] اس زمانہ میں حیدرآباد سے نواب سراج الدین احمد خان سائلؔ دہلوی گلدستہ نکالتے تھے ان کی فرمائش پر غزل کہی گئی

غزل

جو اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ء میں کہی گئی

وہ بات ہے دیکھو مری وحشت کے اثر میں
تم چین سے اب بیٹھ نہیں سکتے ہو گھر میں

مجھ خانہ برانداز کا پوچھو نہ ٹھکانا
گھر ہے مرا جنگل میں تو جنگل مرے گھر میں

تھمتا ہی نہیں آنسوؤں کا جوش کسی دم
کیا بند سمندر ہے مرے دیدۂ تر میں

اُلجھے ہیں جنوں میں جو گریباں سے مرے ہاتھ
اے کاش شبِ وصل لپٹتے یہ کمر میں

پھرتا ہوں زمانے میں تصوّر کے سہارے
کرتا ہوں سفر میں یونہیں بیٹھا ہوا گھر میں

ہو سکتی تھی کیا اور کوئی شکلِ تباہی
دریا میں بھنور ہے مری کشتی ہے بھنور میں

کیوں میری دعا وصل کی مقبول نہ ہوتی
ہندی تو لگی ہی نہ تھی کچھ پائے اثر میں

کیا جانئے کیا بعدِ فنا حال ہو احسن
گھلتی ہے مری جان اسی خوف و خطر میں

غزل

جو دسمبر ۱۹۰۳ء میں کہی گئی

دل ہے واقف میرے ہر ایک راز سے
کام چلتا ہے اسی دم ساز سے

مجھکو اک پردہ نشیں کا عشق ہے
آہ بھی کرتا نہیں آواز سے

حشر کا ہم کو ذرا کھٹکا نہیں
مٹ چکے تیرے خرامِ ناز سے

پھر نہ ہوتا عشق میں کوئی تباہ
دیکھتا انجام گر آغاز سے

گیت گاتے ہیں تمہارے عشق کے
سوز سے مطلب نہ ہم کو ساز سے

پیاس میں ساقی کہاں کی ناپ تول
ڈال بھی دے جام میں انداز سے

آج احسن بلبلِ ہندوستان
کم نہیں ہیں بلبلِ شیراز سے

حضرت احسن کی یاد

جناب مولانا طفیل احمد صاحب

حضرت احسن مارہروی، جن کا نام نامی 'سید علی احسن' تھا اور جنہیں ہم بچپن سے 'شاہ میاں' کے پیارے نام سے پکارا کرتے تھے، مارہرہ شریف کے ایک مقدس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد آخریں اودھ کے مردم خیز قصبہ بلگرام کے خاندانِ سادات سے ایک بزرگ 'شاہ برکت اللہ الملقب بہ صاحب البرکات' وارد مارہرہ ہوئے اور اپنے فیوض و برکات سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا کر وہاں ایک خانقاہ قائم کی جو "سرکار خورد" کہلاتی ہے۔ شاہ میاں اسی خاندان میں ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اوّل قرآن پاک حفظ کیا۔ اس کے بعد مروجہ مشرقی نصاب کے مطابق اپنی ہی خانقاہ میں مختلف اساتذہ سے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی۔ اور طالب علمی ہی کے زمانہ میں اپنے والدین کے ہمراہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں آپ کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا جس سے آپ کی مذہبی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ علی گڑھ کے قرب کیوجہ سے قصبہ مارہرہ میں اس وقت انگریزی پڑھنے کا رواج ہو چلا تھا مگر دیندار لوگوں کو نئی تعلیم سے نفرت تھی اس لئے شاہ میاں اور ان کے خاندان کے بچے اس سے محروم رہے اور اس خاندان کی عظمت قائم رہنے کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ مگر ترقی کے تمام راستے بند ہونے پر بھی شاہ میاں نے اپنی ذہانت، اور محنت سے ایک ایسی راہ نکالی جس پر پڑ کر نہ صرف اپنا بلکہ سادات مارہرہ کا نام تمام ملک میں روشن کیا۔ اس زمانہ میں معمولی انگریزی داں اصحاب بھی غیر ملکی زبان کے غلط سلط الفاظ میں لکھنے اور بولنے پر اور اپنی مادری زبان سے نابلد ہونے پر فخر کیا کرتے تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک جماعت

ایسی تھی جو استقلال کے ساتھ اُردو زبان کو ترقی دینے کی دُھن میں لگی رہتی تھی۔ انہیں میں سے ایک شاہ میاں تھے جنہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۸۹۳ء میں فصیح الملک مرزا داغ دہلوی سے بذریعہ خط وکتابت شرف تلمذ حاصل کیا اور تین سال بعد ۱۸۹۶ء میں اسی شوق میں حیدرآباد جا پہونچے اور مسلسل چند سال اپنے استاد کے پاس ٹھہر کر اپنے ذوق کا تکملہ کیا۔

شاہ میاں نے اپنی تصنیف وتالیف کی ابتدا اپنے استاد کی سوانح عمری "جلوۂ داغ" کی تصنیف سے کی۔ اُس کے بعد "فصیح اللغات" نامی ایک لغت کی تالیف شروع کی جو حضرت داغ کے انتقال کی وجہ سے ناتمام رہ گئی۔ تاہم جس قدر وہ تیار ہوگئی تھی وہ ماہوار رسالہ فصیح الملک میں ردیف الف تک جزء جزء شائع کر دی گئی۔ یہ رسالہ شاہ میاں نے جواب ملک میں "حضرت احسن" کے نام سے مشہور ہوچکے تھے مرزا داغ کی یادگار میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک نکالا۔ اس کے علاوہ مرزا داغ کا چوتھا دیوان "یادگار داغ" کے نام سے بھی آپ ہی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

حضرت احسن "خم خانہ جاوید" مولفہ لالہ سری رام دہلوی کی پہلی جلد کی ترتیب وتدوین میں بھی شامل تھے اور اسی سلسلہ میں برس سوا برس تک وہ لاہور میں مقیم رہے۔ پھر حیدرآباد میں آپ کو امیر مینائی کی ملاقات اور ہم نشینی کا موقع ملا۔ اسی طرح دیگر قدیم طرز کے شعرا اور مشاہیر روزگار سے خصوصیات اور تعلقات رکھتے تھے۔

حضرت احسن زمانہ حاضرہ کے خصوصی متروکات وخیالات سے بے خبر نہ تھے۔ عریانیِ مضامین، رعایات لفظی اور رکاکت معنوی سے ان کا کلام پاک وصاف ہوتا تھا۔ آپ نے "انجمن ترقی اردو" کی فرمائش پر اُردو کے سب سے پہلے شاعر "ولی" کا دیوان مرتب کرکے اس پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ، کی دو فارسی نثر تحریروں کو آپ نے زبان اُردو میں "شاہ کار عثمانی" کے نام سے مرتب کرکے شائع کیا۔ جس کی پسندیدگی میں اعلیٰ حضرت نے حضرت احسن کو اپنے دست وقلم سے اعزاز نامہ تحریر فرمایا

عہد ماضی کے مروّجہ طریقہ پر آپ زیادہ تر غزل گوئی فرماتے تھے جس کا غیر مطبوعہ ذخیرہ تقریباً دو دیوانوں کے برابر موجود ہے۔ غزلوں کے علاوہ مختلف اخلاقی و قومی مضامین پر طبع آزمائی فرماتے رہتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب تارکان موالات میں سے بعض اصحاب نے مہاتما گاندھی کو ساتھ لے کر علی گڑھ کالج پر حملہ کیا اور اُس پر قابض ہوگئے تو باوجودیکہ آپ فرزندان کالج میں سے نہ تھے تاہم اس قومی ادارہ کی محبت میں آپ بیتاب ہوگئے اور اُسکی مدافعت میں چند نظمیں "قوم کا مطالبہ" اور "علی گڑھ کالج کی فریاد" کے عنوانات سے لکھیں جو ہزاروں کی تعداد میں طبع ہو کر شائع ہوئی۔

مگر حضرت احسن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اعلیٰ مرتبہ کا شاعر ہونے کے باوجود آپ کو اُردو نثر میں کچھ کم انہماک نہ تھا۔ چنانچہ آپ کے قلم سے "تاریخ نثر اُردو" کی شکل میں جو خدمت ہوئی وہ ایک اعتبار سے آپ کے تمام کارناموں پر سبقت لے گئی۔ اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے کسی شخص کو یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اُردو نثر اس وقت سے ساڑھے پانسو سال پہلے لکھی جاتی تھی۔ اپنے ذاتی خیالات عمدہ سے عمدہ زبان میں لکھ دینا "علمی تحقیقات" کرنے کے مقابلہ میں نہایت سہل ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ احسن صاحب نے چھ صدیوں کے مختلف ادوار کی تصنیف و تالیف، دفاتر سلطنت، قانونی تراجم، تقریظ و تنقید اور خطوط کے نمونے کہاں کہاں سے لا کر جمع کر دئے اور اُس سے چھ سو صفحات کی پہلی جلد مرتب کر کے رکھدی جس سے اُردو زبان کی تدریجی ترقی ایک نظر میں معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی عظمت بجائے کم ہونے کے روز بروز بڑھتی ہی چلی جائے گی اور اس کے مولّف اور مرتب کا نام زندہ جاوید ہو کر رہے گا۔

حضرت احسن سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے لکچرار رہے۔ اس سترہ سال کے دوران میں اُن کی خداداد ذہانت قابلیت اور محنت سے اُن کی ہر دلعزیزی اور عزت و عظمت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب وہ سبکدوش ہوئے تو بھی خواہاں

اُردو کے مساعی جمیلہ سے، جن میں احسن صاحب کا نمایاں حصّہ تھا ملک کی فضا میں اس قدر تبدیلی ہو چکی تھی کہ اُردو میں بولنا، لکھنا اور پڑھنا اچھا سمجھا جانے لگا تھا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ چالیس پینتالیس سال قبل احسن صاحب جس نیک مشن میں شریک ہوئے تھے وہ انجام کار کامیاب رہا۔ حسن اخلاق اور محبت و مودت آپ کو بزرگوں سے ورثہ میں ملے تھے۔ ان کا وہ بہترین نمونہ تھے۔ اولاد کے اعتبار سے وہ بڑے خوش نصیب تھے اس لئے کہ باوجود اعلیٰ درجہ کے جدید تعلیم یافتہ ہونے کے اُن کے صاحبزادے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔

حضرت احسنؔ، مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن مارہرہ شریف میں قیام پذیر ہوئے۔ جولائی ۱۹۴۰ء میں کل ہند اردو کانفرنس میں بمقام بریلی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر پشت پر چند پھنسیاں نمودار ہوئیں۔ ان میں سے ایک نے زیادہ تکلیف دی جو بڑھ کر کاربنکل ہو گئی۔ ۶ راگست کو اپنے بڑے صاحبزادے سید محمد احسن بی۔ اے۔ اسسٹنٹ رجسٹرار کے پاس بغرض علاج تشریف لائے جہاں ۱۷راگست تک حکیم شبیر احمد صاحب کے مشورہ سے جڑی بوٹی کا علاج ہوتا رہا، تخفیف نہ ہونے پر ۱۸راگست کو اُن کے منجھلے صاحبزادے سید سعید احسن نے انہیں اُن کے سنجھلے صاحبزادے ڈاکٹر سید انعام حسین ایم۔ بی۔ ایس کے پاس پٹنہ پہونچا دیا۔ وہاں میڈیکل کالج میں ۲۲ر اگست کو پھوڑے پر بجلی کے ذریعہ عمل جراحی کیا گیا۔ ۲۸ر تک حالت قابل اطمینان تھی کہ ۲۹ر کو یکا یک گردوں نے اپنا فعل چھوڑ دیا اور اسہال کبدی شروع ہو گئے۔ میڈیکل کالج کے قابل ترین ڈاکٹروں اور استادوں نے امکانی تدابیر اختیار کیں مگر بقول میرؔ "اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا" اور ۳۰راگست ۱۹۴۰ء مطابق ۲۵ر رجب المرجب ۱۳۵۹ھ بروز جمعہ بوقت چھ بجے شام اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم کا جسد خاکی پٹنہ سے مارہرہ لایا گیا اور ۲۶ر رجب مطابق ۳۱راگست بروز شنبہ ۱۱ بجے رات کے خاندانی قبرستان درگاہ برکاتیہ میں سپرد خاک کیا گیا وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

طفیل احمد

احسن الاخلاق

جناب صغیر صاحب جلال آبادی

ہر انسان خواہ وہ امیر ہو خواہ فقیر کسی ملت و فرقے سے تعلق رکھتا ہو بظاہر یکساں اعضاء و قویٰ لے کر عالم وجود میں آتا ہے لیکن قدرت قوائے باطنی اور دل و دماغ کی دولت ہر شخص کو یکساں ودیعت نہیں کرتی۔ ایک شخص اپنی تمام زندگی گوشۂ گمنامی میں گزار دیتا ہے اس کے اعمال و افعال ایسے غیر دلچسپ اور بے سود ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہی نہیں زندگی میں بھی کوئی اس کا نام نہیں لیتا اس کے افعال و عادات کی قدر و قیمت اسی کی ذات تک محدود و مسدود ہوتی ہے اس کی ہستی کے ساتھ اس کا نام بھی صفحۂ دنیا سے مٹ جاتا ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو ایسے شخص کی ہستی دنیا کے لئے بیکار اور اس کا عدم و وجود برابر ہے، لیکن ایک دوسرا شخص جس کو مبدار فیاض سے وہ طبع رسا اور روشن دل و دماغ ملتا ہے کہ وہ اپنے کارہائے نمایاں یا حسن اخلاق کی بدولت اپنی زندگی میں ہزار ہا بندگانِ خدا کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے اس کی ہستی سے انسانیت کو چار چاند لگتے ہیں، ایسا انسان بندگانِ خدا کے لئے کارزارِ زندگی میں سپر کا کام دیتا ہے اس کی نکتہ رس نگاہیں مسِ خام کو کندن بنا سکتی ہیں وہ باوجود جسد خاکی ہونے کے آسمانِ رفعت پر مثل آفتاب عالمتاب چمکتا ہے، نہ صرف اس کی زندگی میں بلکہ انتقال روحانی کے بعد بھی صدہا سال تک اس کا نام عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور وہ بعد فنا بھی دلوں پر حکومت کرتا ہے، چنانچہ شیخ الرئیس آج موجود نہیں ان کے انتقال کو صدیاں گذر گئیں لیکن ہنوز اقلیم طب میں قانون شیخ الرئیس نفاذ پذیر ہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمتہ کے انتقال کو مدتِ مدید گذر گئی گلستانِ جہاں میں ہزار ہا بار بہار بھی آئی اور خزاں بھی لیکن گلستانِ سعدی ہنوز ایک ہی آب و تاب کے ساتھ قائم ہے اسکے

قدر دانوں کی نگاہوں میں اب بھی وہی وقعت ہے۔ دور ہی کیوں جائیے ہندوستان میں شاید ہی کوئی لکھا پڑھا ایسا متنفس ہو جس نے مرزا غالب کا نام نہ سنا ہو اور جوان کی خداداد قابلیت کا معترف نہ ہو۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اب بھی مرزا غالب کے معتقدین و مداح موجود ہیں گو خود مرزا غالب کو زندگی بھر اپنی نا قدری کا شکوہ رہا لیکن ان کی وفات کے بعد آج سے کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ جب دیوان غالب ایک سَو دس روپیہ فی کاپی کے حساب سے فروخت ہو چکا ہے اور آج تک ہر شاعر و ادیب مرزا کی قوتِ متخیلہ و معنی آفرینی کا مداح ہے۔

ڈاکٹر اقبال کو زندگی ہی میں اس بے قدری کے زمانے میں جو مقبولیت اور وقعت حاصل ہوئی وہ اہلِ نظر کی نگاہوں سے مخفی نہیں، ہندوستان کے علاوہ ایران، افغانستان اور ممالک یورپ وغیرہ تک ان کے مداح ہیں اور ان کی تصانیف کے تراجم دیگر ممالک کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

الغرض ہر ملک اور ہر مذہب و ملّت میں قدرت کی طرف سے ایسی کامل ہستیاں عالم وجود میں آئی ہیں جن کے کارہائے نمایاں لائق قدر اور نظام عمل، حسن اخلاق، اقوال و افعال ابنائے زماں کے لئے شاہراہِ زندگی میں خضر راہ سے کم نہیں، چنانچہ ہمارے مخدوم بزرگ حضرت مولانا حاجی حافظ شاہ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی علیہ الرحمتہ کی ذاتِ گرامی بھی اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہمارے لئے باعث فخر و مباہات تھی، مرحوم کی ذاتِ گرامی محتاج تعارف نہیں ادب اُردو اپنے اس محسن کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ مرحوم کی یاد ہمارے دلوں میں تا زیست کل النقش فی الحجر بنکر مرتسم رہے گی اور کیوں نہ ہو جب کہ ادب اُردو کا ہر مبتدی و منتہی اقلیم ادب کے اس تاجدار کے نام نامی اور کارہائے نمایاں سے واقف و شناسا ہے اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں آپ کے معتقدین و مخلصین احبار و تلامذہ موجود ہیں مرحوم کی عمر اس وقت ۲۲۔۲۳ سال سے زیادہ نہ ہو گی کہ جب جہاں استاد فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ

دہلوی مرحوم مغفور نے اپنے اس ہونہار شاگرد کی خداداد قابلیت کا اعتراف و اظہار اسطرح کیا ہے

سید احسن جو میرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں "جن کو اللہ نے دی فکر رسا، طبع رسا"

ایک فاضل استاد اپنے شاگرد کو اسی وقت دوست کہہ سکتا ہے جب کہ شاگرد میں غیر معمولی قابلیت موجود ہو اور وہ کچھ اہلیت رکھتا ہو۔

ڈاکٹر سر اقبال کا ایک مکتوب جناب عبدالمجید صاحب سالک مدیر "انقلاب" کے نام ہے اس کی شان صدور یہ ہے کہ جناب سالک نے علامہ اقبال کی خدمت میں تلمذ کے لئے لکھا اس کے جواب میں علامہ موصوف نے فرمایا کہ میں اس کے لئے موزوں نہیں اگر آپ چاہیں تو سید علی احسن صاحب احسن مارہروی یا منشی حیات بخش صاحب رسا سے رجوع کیجئے اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کی نظر میں بھی حضرت مولانا مرحوم کا درجۂ شاعری بہت بلند تھا اور وہ اپنے برادران خواجہ تاش میں مرحوم کو بہت ممتاز سمجھتے تھے:

حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی اپنے مضمون " رحلتِ احسن الشعرا" مطبوعہ " شاعر" ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا علیہ الرحمتہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

" میں جانتا ہوں کہ مرحوم کو فارسی اور عربی زبانوں میں کافی دستگاہ حاصل تھی............ اردو زبان کے تو وہ محقق اور مصلح تھے ":

اسی مضمون میں آگے چلکر فرماتے ہیں۔

" مرحوم ایک کہنہ مشق شاعر اور دیدہ ور ادیب تھے ان کے کلام میں جہاں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم کی سادگی پرکاری تھی وہاں تخیل میں بلندی اور فکر میں ہمہ گیری بھی تھی اس میں شک نہیں کہ وہ تغزل قدیم کی حدود سے دانستہ کبھی باہر نہ نکلے مگر ان کے کلام میں دور جدید کے تمام جدید ذہنی انقلابات بھی موجود تھے۔ علم و فن کے اعتبار سے ان کے کلام پر حرف گیری کا موقع آج تک کسی کو نہ مل سکا اس لئے

کہ وہ عروض و قافیہ اور علم کلام سے کما حقہ واقف تھے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور بساطِ علم وسیع تر۔"

اگر حضرت مولانا مرحوم کے کمالات شاعری کا تذکرہ کیا جائے یا ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے جس کا نہ یہ عنوان حامل ہو سکتا ہے اور نہ راقم الحروف مکمل طور سے اس کا اہل، یہ کام حضرت مولانا مرحوم کے ہمعصر اساتذہ اور ادبا بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔

اس وقت ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مرحوم کے کمالات شاعری کے علاوہ چند ان اوصاف حمیدہ اور حسن اخلاق کا تذکرہ کیا جائے جن کی بدولت ایک انسان کو اکمل الانسان کہا جاسکتا ہے یا جو ہمارے لئے اور ہماری آنے والی نسلوں کے لئے شاہراہِ زندگی میں خضر راہ کا کام دے سکیں۔

جن حضرات کے مرحوم سے تعلقات رہے ہیں یا جن کو کبھی مرحوم سے ملاقات کا موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ مرحوم جس پایہ کے ادیب اور شاعر تھے اسی قدر ان کا حسن اخلاق بھی اعلیٰ و ارفع تھا ایسی محترم اور بزرگ ہستیوں کو فی زمانہ اگر عنقا کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔

اگر مرحوم کے اخلاق، محبت و یگانگت۔ ملنساری، استغنا، بردباری، انکساری اور خلوص وایثار وغیرہ وغیرہ اوصاف پر مفصل بحث کی جائے تو تنہا یہ مضمون جس کے لئے اس رسالہ کے چند صفحے مخصوص ہو سکتے ہیں بذاتِ خود ایک رسالہ بن جائے گا لہذا فی الحال ہم ناظرین کو مرحوم کے حسن اخلاق کے چند نمونوں سے (اور وہ بھی مرحوم کے مکتوبات سے اقتباس کرکے) روشناس کرائیں گے خطوط کا اقتباس اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات کو مرحوم سے ذاتی تعارف نہ تھا یا جن سے خط وکتابت نہ تھی مرحوم کے مکتوبات سے وہ خود مرحوم کے اخلاق کا اندازہ کر سکیں اگر کسی شخص سے براہ راست اس کے متعلق معلومات حاصل کرتی ہوں تو اوّل اس کا ذریعہ ملاقات اور بعدہٗ بقول مشہور "المکتوب نصف الملاقات" ہو سکتا ہے، ہمارا خیال ہے کہ

اگر کسی شخص کے تمام عمر کے ہر قسم کے مکتوبات فراہم کرلئے جائیں تو اس طرح اس کے مکمل سوانح حیات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے مطالعے سے اس کے ہر شعبۂ زندگی پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔ نیز اگر ہم خود اپنے الفاظ میں مرحوم کے اوصاف حمیدہ کی تعریف بیان کریں تو شاید غیر متعارف حضرات اس کو شاگردانہ مدح سرائی سے تعبیر کریں "۔

ایک خلیق اور مشفق استاد اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد سمجھتا ہے اور ان کی تربیت کرتا ہے اسی طرح سعادت مند شاگردوں کی نگاہوں میں استاد کا مرتبہ اپنے باپ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی زیادہ، مندرجہ ذیل مکتوب کی شانِ نزول یہ ہے کہ ماہ اگست ۳۹ء میں حضرت مولاناؒ دہلی تشریف لائے اطلاع ملنے پر راقم الحروف بھی قدمبوسی کے لئے دہلی پہونچا مگر وہاں سے واپس آکر دو ہفتہ تک حسب معمول کوئی نیاز نامہ ارسالِ خدمت ممدوح نہ کر سکا آخر مشفق آقا نے خود اپنے ادنیٰ غلام کی خیریت معلوم کرنے کے لئے پیش قدمی کی جس کے لفظ لفظ سے خلوص و محبت ٹپکتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

عزیزم السلام علیکم

" ۲۰ر اگست کی ملاقات کے بعد اس وقت تک خلاف عادت آپ کا محبت نامہ نہیں ملا۔ جس سے تعلق خاطر ہے، اس مرتبہ آپ کی آمد دہلی آپ کے لئے باعثِ تکلیف ہوئی جس کا مجھے احساس ہے۔ مگر پردیس کی وجہ سے مجبوری تھی بہرحال آپ کی سعادت و رشادت سے امید ہے کہ آپ اس کا خیال نہ کریں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے اپنا دعاگو سمجھکر خیریت لکھتے رہیں گے۔

ہفتہ بیس روز بعد کل سے یہاں رحمت الٰہی کا نزول ہو رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے"

دسمبر ۳۹ء میں کل ہند اردو کانفرنس کے موقعہ پر حضرت مولانا مرحوم مغفور کی آمد دہلی کی اطلاع ہوئی تو راقم الحروف نے بھی سفر دہلی کا قصد کیا اور مولانا مرحوم کو لکھا کہ آپ کس تاریخ تک دہلی تشریف لائیں گے، اس موقعہ پر میں حاضر خدمت ہونے کا قصد کر رہا ہوں، چونکہ

سردی کا موسم تھا اور برادر محترم سید احسن صاحب کا مکان مختصر اس وجہ سے یہ بھی لکھ دیا کہ میرا قیام ایک دوست کے مکان پر رہے گا، لیکن مولانا مرحوم مغفور کے خلوص و محبت نے اس کو گوارا نہ کیا اور لکھا گیا:

عزیزم

"۲۵، ۲۶ تک دہلی کا قصد ہے۔ تمہاری جگہ دل میں ہے اور دل بظاہر دلّی سے ایک حرف کم رکھتا ہے مگر گنجائش باطنی اس سے بہت زیادہ ہے لہٰذا دہلی آکر پہلے میرے پاس ہی آنا پھر دیکھا جائے گا، وہاں کا پتا یاد رہے۔ راؤس ایونیو ۵ نئی دہلی"

برادر مکرم مولوی غلام مصطفیٰ خاں صاحب پروفیسر کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی مولانا مرحوم کے جوان العمر مگر چشم بددور قابل اور سعادت مند شاگرد ہیں۔ کچھ عرصہ تک چند مصروفیتوں کے باعث مولانا مرحوم کو خط نہ لکھ سکے اور جب خط لکھا تو اس کی معذرت چاہی اس کے جواب میں ۲۵ مارچ ۳۹ء کو مولانا مرحوم فرماتے ہیں:

اعزی واحبی السلام علیکم ۔۔۔۔۔۔۔

"آپ خط نہ بھیجنے کی معذرت عبث کرتے ہیں میں خود شرمندہ ہوں کہ مدت سے خط نہ بھیج سکا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے آپ کی مخلصانہ محبت کا احساس ہے اور واللہ باللہ میں بھی آپ کو اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھتا آپ میرے متعلق جو حسن ظن رکھتے ہیں یہ آپ کی انتہائے سعادت و شرافت ہے۔ میں کیا اور میری سوانح عمری کیا لیکن آپ کی خوشی ہے تو آئندہ اس کے متعلق کچھ لکھوں گا ابھی چند روز اور معاف کیجئے"

بھائی ابرا حسنی گنوری مولانا مرحوم کے شاگرداں خصوصی میں ایک ممتاز ہستی ہیں۔ ۱۹ دسمبر ۲۸ء کے لئے آپ نے مولاناؒ کو اطلاع دی کہ میں قدمبوسی کے لئے حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ اس سے قبل

بھائی اَبرصاحب کو حضرت مولانا سے ذاتی تعارف نہ تھا ایسے موقعہ پر شفیق استاد اپنے نادیدہ شاگرد کی سہولت اور تعارف کے لئے اپنے خلوص و محبت کے زیر اثر کیا ذریعہ تجویز فرماتے ہیں۔ ذیل کا خط قابل ملاحظہ ہے مگر یہ واضح رہے کہ ایک شاگرد استاد سے ملنے آرہا ہے کوئی ہم رتبہ یا ہم عمر دوست نہیں اور شاگرد بھی کوئی والئ ریاست نہیں کہ کسی لالچ یا طمع نفسی کی بدولت استاد نمائشی محبت کا اظہار کر رہا ہے۔

منشی افتتاح الرحمٰن صاحب۔ السلام علیکم

"اَبر گنوری اس وقت ۱۱½ بجے کی ٹرین سے حسب اطلاع آنے والے ہیں چونکہ ہمارے لڑکوں میں کوئی ان کا پہچاننے والا نہیں ہے اس لئے بغیر آپ کی رہبری کے کام نہیں چل سکتا ہے۔ لہٰذا وقت آگیا ہے اسٹیشن چلے جائیے۔ والسلام"

جناب سید محمد اختر صاحب اختر نگینوی مولانا مرحوم کے خواجہ تاش ہیں ۱۹۳۸ء میں مولانا نے نگینے کی جانب دو مرتبہ سفر کیا مگر اختر صاحب موصوف کو نہ اس کی اطلاع دے سکے اور نہ ایسا موقعہ ہوا کہ ایک دو یوم کے لئے نگینہ بھی قیام فرما لیتے اختر صاحب کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو بیحد افسوس ہوا اور طویل و عریض شکایت نامہ ارسال کیا، اس کے جواب میں ۳ر اگست ۳۸ء کو لکھتے ہیں۔

کفر ست در طریقۂ ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

"برادرم السلام علیکم۔ محبت نامہ ملا۔ آپ کے سارے مضمون کا جواب عنوان کے شعر میں موجود ہے لہٰذا اس کی تشریح و تصریح فضول۔ میں اتفاق سے ایک سال میں دو مرتبہ دہرہ دون لائن سے گذرا اور ہر مرتبہ نگینے کی یاد نقش بن کر ابھری مگر وقت نہ ملنے سے آپ سے نہ مل سکا .... میں خدانخواستہ آپ کو مردہ کیوں سمجھنے لگا ہیں

البتہ نیم مردہ ہوں اس کی ایک علامت تو یہ ہے کہ امسال بوجہ پیرانہ سالی مسلم یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہوگیا۔"

خلوص و محبت اور بے غرض دوستی کا ایک اور نمونہ یہ مکتوب ہے جو سید محمد اختر صاحب نگینوی ہی کے نام ہے۔

"بھائی اختر صاحب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ جس کے لفظ لفظ سے خلوص و یگانگت ٹپکتی تھی پہنچا یاد آوری کا شکریہ! میں بحمد اللہ نہ کم نظرت نہ اوچھا۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں جن باتوں کے لئے کبھی لکھا تھا وہ ایک وقتی بات تھی اور اپنا عزیز سمجھکر لکھا تھا اگر اس کی تعمیل نہ ہوسکی تو اس کا مطلب خدانخواستہ قطع محبت نہیں۔ بہرحال میں وہی ہوں جیسا تھا اور دعا ہے کہ ویسا ہی رہوں۔"

میرے محترم بھائی ابر گنوری جہاں تک، مجھے علم ہے ایک ضدی قسم کے انسان ہیں کسی کی کوئی بات سن کر خاموش ہونے والے نہیں بلکہ ترکی بہ ترکی جواب دینے والے ہیں اسی قسم کا کوئی واقعہ کسی کے ساتھ ہوگیا حضرت مولاناؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو کس محبت و شفقت سے مثل اپنی اولاد کے ابر صاحب کے باران غیظ و غضب کو روکتے ہیں اور اپنی شہرت و مقبولیت سے بھی بے نیازی کا اظہار فرماتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

"عزیزم! السلام علیکم۔ کارڈ پہنچا اسی طرح خیریت سے شاد و مطمئن کرتے رہو۔ یار تم سے اتنا منع کیا مگر تم نہیں مانتے کوئی برخلاف ہوا کرے تمہیں کیا مجھ میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ کسی کو صلاح و اصلاح کی ضرورت ہو۔ جن حضرات کا تم نے حوالہ دیا ہے فی الحقیقۃ وہ خود مصلح ہیں۔ کبھی کبھی ایسا موقع ہوا ہے کہ انہوں نے مجھے شریک مشورہ کیا ہے مگر جب

ان کی استعداد بجائے خود درجۂ اجتہاد حاصل کر چکی تو بیکار ایک ناقص سے کیوں واسطہ رکھتے، تمھیں ان کی مہربانی و نامہربانی کا احساس نہ ہونا چاہئیے اور میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ خواہ مخواہ اپنی غزل کی تعریف اپنے منھ سے کی جائے۔ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ لَا یُعْلیٰ۔ اس میں بھی شانِ عزور وعجب ہے جو پسندیدہ روشن نہیں، میں اس کو بھی زیادہ مناسب نہیں سمجھتا کہ بے تکلف ہر شخص سے رشتہ مندی کا سلسلہ لفظاً جاری رکھا جائے۔ کیا بغیر چچا۔ ماموں۔ "تائے کے کسی کی حقیقی عزت و وقعت نہیں ہو سکتی، کاش تم اکثر مجھ سے ملتے رہتے تو ٹھیک بنا تا بہر حال اپنی خیریت لکھتے رہو اور اپنے کام سے کام رکھو۔ فوٹو کیا اس کے پروف کا بھی اب تک پتا نہیں وہ مکمل ہو گیا تو ہر حالت میں ایک تمہارے لئے لے لوں گا۔ والدعا"

شروع ماہ اگست ۱۹۴۶ئ میں ایک نیاز نامہ میں نے ارسال خدمتِ مخدوم والا کیا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت مولاناؒ کاربنکل کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے اس کش مکش میں کئی روز تک جواب نہ دے سکے کاربنکل جیسا موذی مرض جس میں ایک لمحہ بھی مریض کو سکون میسر نہیں ہوتا اسی بے چینی اور شدت تکلیف میں حضرت مولاناؒ بغرض معالجہ علی گڑھ تشریف لے آئے مگر شفیق استاد کے دل خلوص منزل میں اس شدتِ تکلیف میں بھی اپنے غلام کی وہی محبت رہی چونکہ خود اس قابل نہ تھے کہ بآسانی خط لکھ سکتے لہذا بقلم دیگر نوازش نامہ لکھایا گیا جو مندرجہ ذیل ہے۔

عزیزی صغیر صاحب السلام علیکم

آپ اپنے کارڈ کے جواب نہ پانے سے متردد ہوں گے اور آپ کا خلوص آپ کو بے چین کئے ہوگا۔ میں اپنا حال کیا لکھوں۔ پشت پر کاربنکل نکلا ہے اور آج دس بارہ روز سے جو اذیت پا رہا ہوں ؎

من دانم و داند دل من

ایک علاج شروع کیا ہے ۶ روز ہو چکے ہیں بظاہر اسباب کچھ افاقہ ہے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس سے نجات دے تو پھر کچھ بات کروں زیادہ نہ گھبرانا میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں کر اہ اور آہ کی وجہ سے کہ ایک حرف بھی لکھ سکوں۔ مگر خلوص سے متاثر ہو کر یہ کارڈ لکھوا رہا ہوں۔ والسلام

دعاخواہ و دعاگو

احسن بقلم دیگر

بہت سے حضرات اس قدر تغافل آشنا اور سست مزاج ہوتے ہیں کہ اپنے احباب وشناسا کے خطوط آنے پر زحمت پاسخ نگاری گوارا نہیں کر سکتے حتیٰ کہ ضروری اور جوابی خطوط بھی ہضم کر جاتے ہیں یا بہت تاخیر کے بعد اگر کچھ خیال آگیا تو جواب لکھ دیا ورنہ نہیں۔ مولاناؒ اس کے سخت مخالف تھے اور ضعیف العمری میں بھی ہر کس و ناکس کے خط کا جواب دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جن شاگردوں سے بے تکلفی یا تعلقات خصوصی تھے وشاذ و نادر ہی جوابی خطوط لکھتے تھے اور اگر کبھی کسی شاگرد یا عزیز نے ایسا کیا تو اس کا شکوہ کرتے تھے۔ مثلاً راقم الحروف کے نام ایک مکتوب گرامی مرقومہ یکم جون ۴۲ء ہے اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"عزیزم وعلیکم السلام

جوابی کارڈ پہنچا۔ سادہ کارڈ کافی تھا۔ میرے تمہارے تعلقات ایسے نہیں کہ تین پیسے کا مُنھ کیا جائے اس میں بوئے مغائرت آتی ہے"۔

دوسرا خط بنام برادرم رازؔ احسنی سہوانی صاحب مرقومہ ۵ ار مئی ۳۵ء ہے جس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

عزیزم السلام علیکم

"جوابی کارڈ ملا۔ اس تکلیف کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر سادہ کارڈ آتا تو بھی جواب دینا لازم ہو جاتا۔ نہیں تمھیں شرمندہ ومحجوب

ہونے کی ضرورت نہیں، خلوص چاہئیے دکھاوے کا میں عادی نہ تھا" الخ

تیسرے خط بنام جناب راگھو وینیدر راؤ صاحب جذب مرقومہ ۱۰ر مارچ ۳۵ء کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"لطف فرمائم تسلیم

رباعیات جذب کی رجسٹری دو چار روز ہوئے پہونچی پھر والا نامہ دستیاب ہوا۔ کرم بالائے کرم کا منت پذیر و شکر گذار ہوں" اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی" عنایت نامہ میں جواب کے لئے لفافہ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ پاسخ نگاری میرا فرض تھا اگر آپ یاددہانی نہ فرماتے تو بھی نیاز نامہ حاضر ہوتا۔ مگر شاید دو چار روز کی دیر ہو جاتی"۔ الخ

برادرم ابر گنوری حضرت مولاناؒ کے محبوب و مخصوص شاگردوں میں سے ہیں ابر صاحب کے توسل سے کسی صاحب نے ایک کتاب بغرض ریویو بھیجی۔ عموماً مصنف اپنی تالیف و تصنیف انہیں حضرات کی خدمت میں بغرض تبصرہ پیش کرتا ہے جن سے کچھ تعلقات ہوں یا اپنے حق میں تقریظ کی کچھ امید ہو۔ مگر حضرت مولاناؒ کی راست گفتاری اور صاف گوئی کا نمونہ ملاحظہ ہو گرامی نامہ مورخہ ۲ر ستمبر ۳۲ء میں ابر صاحب کو لکھتے ہیں۔

"عزیزم السلام علیکم

.... پیکٹ بصارت افروز ہوا آپ حسب تحریر نہ آئے ورنہ میرا حال بچشم خود دیکھتے اور انصاف کرتے کہ ایسا شخص ایک حرف بھی لکھ سکتا ہے یا نہیں۔ میں عجب گو مگو میں ہوں۔

.... کی طباعت اس قدر ناقص اور خراب ہوئی ہے کہ تبصرہ لکھنے والا اس کے مطالعے سے اندھا ہو جائے گا۔ سطریں کی سطریں مغشوش و مشکوک ہیں ایسی کتاب کسی نصاب کی کمیٹی میں پیش کرنا نامنظوری کا

پیش خیمہ ہے۔ تعجب ہے کہ مصنف ایم۔ اے۔ ایل ایل بی ہیں اور نداقِ وقت سے اس قدر غافل۔ میں کسی کتاب پر نہ تو رعایتی تبصرہ لکھ سکتا ہوں اور نہ بغیر بالاستیعاب پڑھے ہوئے کچھ لکھ سکتا ہوں آپ یا کوئی صاحب بُرا نہ مانیں ہر شخص کو اپنے اپنے پوزیشن کا لحاظ ضروری ہے میں نے ابتک نثر پڑھی ہے اور اس میں کئی جگہ غلطیاں پائی ہیں۔ نظم پڑھ لوں تو رائے لکھوں مگر میری رائے ہے کہ ایسی بری چھپی ہوئی کتاب کبھی منظوری کے لایق نہیں ہوسکتی کیونکہ دیکھنے والے ظاہر کو دیکھتے ہیں باطن پر بہت کم نظر پڑتی ہے اگرچہ اَلْحَقُّ مُرٌّ کے مطابق یہ الفاظ ناگوار ہوں گے مگر سچائی کا اظہار ناگزیر ہے۔ والسلام"

اقتباس ذیل از مکتوب بنام برادر مکرم مولوی غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم' اے ہے' حضرت مولاناؒ کی شانِ استغنا اور جذبۂ خدمتِ خلق کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

"مسلم یونیورسٹی سے علیحدگی یا دنیا سے جدائی بہرحال ایک دن ہوتی اور ہوگی اس لئے اس کا ملال عبث اور اس کا خیال فضول ہے اب یہ دعا کیجئے کہ باقی انفاس خدمتِ خلق میں صرف ہوں اور بقیہ زندگی پر کوئی حرف نہ آئے۔ الخ"

بعض انسانوں کی طبیعتیں ایسی مکدر ہوتی ہیں کہ خواہ مخواہ دوسروں سے الجھنا اور بحث ومباحثہ کرنا اپنی شہرت وناموری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ حضرت مولاناؒ ہمیشہ اس کے مخالف اور صلح کل کے پابند رہے اور اسی کی تلقین اپنے معتقدین کو کرتے رہے اس کے لئے دو خطوط کا اقتباس پیش کرکے فی الحال یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے مکمل احسن المکاتیب کا مجموعہ زیر ترتیب ہے جو انشا اللہ جلد کتابی صورت میں پیش کیا جائے گا جس میں حضرت مولاناؒ کے ادبی علمی اخلاقی ہر قسم کے مکمل مکتوبات ہوں گے۔

(۱) یہ اقتباس از مکتوب بنام برادرم اَبر احسنی گنوری ہے۔

سنتا ہوں کہ . . . . وغیرہ سے جو آویزشیں اور سازشیں جاری ہیں اس میں تمہاری آویزشیں بھی ہیں اگر یہ صحیح ہے تو افسوس ہے عزیز من ایسی الجھنوں میں پھنسکر اپنی مطمئن زندگی کو کیوں بے لطف بناتے ہو بس اسی حد تک اس قسم کی سخن گسترانہ باتوں میں حصہ لینا چاہئیے جہاں تک متانت اور سنجیدگی قائم رہے اس حد سے بڑھنا ذلت وخفت اور بدنامی کا باعث ہے۔"

(۲) اقتباس از مکتوب بنام برادرم سید محمد مبین صاحب ماہر تیھوی،

. . . . کے اعتراضات کی فکر نہ کیجئے، اور" قدر پہچانی " کو صحیح سمجھ کر رہنے دیں آپ نے جو مثالیں لکھی ہیں سب صحیح اور مناسب ہیں مگر میں فضول بحثا بحثی پسند نہیں کرتا اور اس طرح تضیع اوقات نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اس سلسلہ کو منقطع کیجئے اپنے کام سے کام رکھئے۔"

صَغیر ابن نذیر جلال آبادی
(مظفرنگر)

واقعاتِ احسن

جناب غلام مصطفےٰ خاں صاحب ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)
کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار)

آج ایسے بزرگ ادیب اور اُستاد کے متعلق کچھ کہنا ہے جن کی وفات کم از کم میرے لئے رسمیہ نہیں، بلکہ حقیقی معنی میں "ناگہاں" تھی۔ کیونکہ وہ بزرگ یعنی حضرت مولانا مولوی حافظ قاری حاجی سیّد شاہ علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی اپنی وفات کے دو تین ماہ قبل سے غالباً اپنی پریشانیوں کی وجہ سے مجھے کوئی جواب نہ لکھ سکے تھے۔ لیکن اُن کی علمی و ادبی مصروفیتوں کا حال اُس دوران میں بھی مجھے بعض اخباروں سے معلوم ہوتا رہتا تھا اس لئے میں بھی خاموش تھا۔ بہرحال جس بزرگ کا حال اور قال یوں تھا۔ کہ:۔

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو ہمہ خنداں بُدند و تو گریاں
پس چناں زی کہ وقتِ مردنِ تو ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

اُس کے ماتم میں کیسے صبر آئے اور یہ دل کس طرح بہلایا جائے؟۔ خیر۔ بقولِ میرؔ:۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

مجھے یہاں حضرت احسنؔ مرحوم کی ۷۶ سالہ زندگی کے حالات بیان نہیں کرنا ہے بلکہ کچھ ایسے واقعات پیش کرنا ہے جن کو میں زمانۂ شاگردی میں خود مطالعہ کرتا تھا یا کسی سے معلوم کرلیتا تھا۔

یوں تو میں علی گڑھ میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۶ء تک رہا لیکن سب سے پہلے مجھے ۱۹۲۹ء میں حضرت احسنؔ سے مستفیض ہونے کا موقع نصیب ہُوا جب کہ میں فرسٹ ایر میں تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ مجھے مذہبی بحث و مباحثے میں خاص انہماک تھا اور جس کا سودا میں اپنے وطن جبل پور سے لے کر گیا تھا۔ اوّل تو اُس عمر میں میری سمجھ ہی کیا! لیکن بعض اہم مسائل مثلاً حجرِ اسود کی حقیقت، معراج، قرآن پاک کے مضامین کا تسلسل اور معتزلہ فرقے کے اعتراضات کے جوابات وغیرہ کو حضرت احسنؔ ایسے

دلائل کے ساتھ مجھے سمجھا دیتے تھے کہ اب بھی غور کرتا ہوں تو اُن کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔

اُس زمانے کے بعد پھر مستقل طور پر میں نے ۱۹۳۵ء سے اُن کی آخر عمر تک اُن سے علم ادب میں استفادہ کیا اور جس شفقت اور خلوص کے ساتھ اُنہوں نے مجھے مستفید فرمایا اُس کی مثالیں کم ملتی ہیں ۳۵ء میں ایم اے فارسی میں پاس کرنے کے بعد میں نے اردو کلاس میں بیٹھنے کی اجازت حاصل کی تو چونکہ مجھے حاضری کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اطمینان کے ساتھ کلاس کو جاتا تھا اور حضرت احسن اُس وقت تک کچھ لکھا پڑھا بھی چکتے تھے لیکن محض میری وجہ سے دوبارہ شروع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "بیٹا۔ تیرا حق مجھ پر زیادہ ہے" یہ حق دراصل اخلاقی تھا اور ایسی سراپا اخلاق ہستی یہ۔ جس کا ہر لمحہ فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ فرائض اخلاقی میں صرف ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے لفظ "لیکن" کی اصلیت کسی طالب علم نے پوچھی۔ حضرت احسن نے ہم لوگوں کو مخاطب کیا۔ ہم لوگ خاموش ہوگئے۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے عرض کیا کہ "یہ لفظ غالباً لاکن سے اِمالہ کرکے بنایا گیا ہے جس طرح کہ قرآن شریف میں حضرت امام حفص رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لفظ مجرا ھا میں امالہ کیا جاتا ہے" یہ سُن کر حضرت احسن بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اِمالہ سمجھانا شروع کیا۔ پھر علم قرأت کے مختلف اماموں کے مختلف امالے اس وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے کہ اچھے سے اچھا قاری بھی بمشکل اس صحت کے ساتھ بیان کر سکے گا۔

اِس وسیع النظری کا یہ حال تھا کہ اگر کسی لفظ کے استعمال پر بحث ہوتی تو نہایت برجستگی کے ساتھ اُردو کے مختلف شعراء کے اشعار حوالے کے لئے پیش کرتے تھے۔ اگر اُس لفظ کا تعلق فارسی سے ہوتا تو فارسی شعراء کے یہاں اُس کا استعمال بتاتے تھے اور اگر عربی سے کوئی تعلق ہوتا تو عربی کے مختلف استعمال سے آگاہ فرماتے تھے۔ یہ خصوصیت اُن کے یہاں ایسی تھی جو بہت کم بزرگوں میں پائی جاتی ہے۔

اُن کی دقیق النظری کی بھی اکثر مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ اور یہ تو حضرت احسن کے متعلق

کئی مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے محض امتحان کے طور پر مختلف شعراء کے ہم وزن و ہم قافیہ اشعار خلط ملط کرکے رکھ دیئے اور اُن سے شاعر کا نام پوچھا۔ انہوں نے ہر شعر کو الگ الگ کرکے رکھ دیا اور کم از کم یہ ضرور بتا دیا کہ فلاں شعر فلاں عہد اور فلاں اسکول سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا اُنھیں شعر کی نبض پہچاننے میں خاص مہارت تھی اور یہ سب کچھ اُن کی پختہ کاری اور کہنہ مشقی کی وجہ سے تھا۔

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک اچھا ناقد اچھا شاعر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک اچھا شاعر اچھا ناقد نہیں ہوتا۔ لیکن ایسے اشخاص جن میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہوں بہت کم ہوتے ہیں۔ خدا کا کرم و احسان تھا کہ علی گڑھ کی قسمت میں حضرت احسن کی ہستی ان دونوں خوبیوں کی جامع تھی۔ اُن کی تنقید عموماً مولانا حسرت موہانی کی طرح مختصر لیکن جامع ہوتی تھی اور حشو و زوائد سے بالکل پاک۔ چنانچہ انہوں نے تاریخ نثر اردو میں جن انشا پردازوں کے متعلق محض "تبصرہ" کیا ہے وہ اتنا کافی ہے کہ اُس کا اجمال کسی طرح بھی تفصیل سے کم نہیں ہے۔ اُردو نثر کے ارکانِ خمسہ اور دہلی و لکھنؤ اسکول کے متعلق بہت لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور خوب خوب لکھا ہے لیکن حضرت احسن نے اس تاریخ میں جس ایجاز و جامعیت کے ساتھ تنقید کی ہے حق تو یہ ہے کہ ابھی تک کسی بزرگ نے اُس پر ایک لفظ بھی نہیں بڑھایا۔ اسی طرح میرؔ، غالبؔ اور داغؔ پر جو کچھ انہوں نے وقتاً فوقتاً لکھا، یا طلبہ کو لکھوایا وہ بلا شک وشبہ بہترین تنقیدوں میں شمار ہوگا اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

حضرت احسن میں یہ خاص بات تھی کہ وہ ہر شخص کی ادبی خدمت کو سراہتے تھے اور عقیدی کی بہت زیادہ ہمت افزائی فرماتے تھے بلکہ اُس کے پوشیدہ جوہروں کو نمایاں کرنے میں کوشش بھی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی کتاب کے متعلق اگر ہم لوگوں کو تنقید لکھنا چاہتے تھے تو پہلے تلاش کرتے تھے کہ کسی دوسرے شخص کی تنقید مل جائے۔ اگر وہ مل جاتی تو وہی لکھا دیتے تھے۔ حالانکہ ہم لوگ بخوبی سمجھتے تھے کہ اس سے بہت زیادہ بہتر خود حضرت احسن لکھا سکتے ہیں اور لکھا بھی

دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسی تنقید لکھا دینے کے بعد اُس کی خصوصیات پر بحث کرتے تھے اور جو کچھ باقی رہ جاتا تھا اُس پر پھر مدلّل و مفصل تبصرہ کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حق گوئی کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی بڑا ادیب اور نقاد غلط بیانی کر جائے۔ چنانچہ تاریخ نثر اردو میں انھوں نے ہرگز کسی بڑے ادیب اور نقاد کی تحقیقی اور تنقیدی غلطیوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ضرور اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے خدانخواستہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ غلطیوں سے پاک تھے۔ وہ بھی انسان تھے اور "تقاضائے بشریت" کے وہ خود قائل تھے بلکہ اکثر اس کو یاد بھی کرتے تھے۔ لیکن حق گوئی کو وہ ضرور اپنے ذاتی تعلقات پر ترجیح دیتے تھے اور یہ رویّہ شروع جوانی ہی سے اُن میں پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو اُن سے ذاتی بغض پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اُن کی "اصلاحِ سخن" خواہ بہترین اصلاحوں میں شمار ہو سکے لیکن اُس میں بھی بعض لوگوں کو ستم ظریفی کا موقع مل گیا۔ اسی طرح خواہ اکبر الٰہ آبادی انھیں علمِ عروض کا امام سمجھیں اور کم از کم داغ کے تمام شاگرد انھیں قواعدِ زبان میں فرد سمجھیں لیکن "اردو لشکر" کے خلاف پھر بھی علمِ بغاوت بلند کیا جاتا تھا۔ "کسوت الشمین" میں خواہ کتنی ہی حقیقت بیان کی جائے لیکن "احوال" نظریں اسے بھی نہ دیکھ سکیں "تخمینین" اور "کارنامۂ غم" خواہ مذہبی عقیدت میں محض جزوی رنگ لئے ہوئے ہوں لیکن محض اسی رنگ کو دیکھ کر اُن کی پوری شاعری پر فتویٰ صادر کیا جائے۔ "کلیاتِ ولی" کو مختلف نسخوں کے تطابق اور تحقیقی و تنقیدی مقدمے کے ساتھ مرتب کرنا یورپ میں کم از کم پی ایچ ڈی کے برابر ضرور اہم ہوتا لیکن افسوس کہ چند تنگ نگاہیں اُسے بھی نہ دیکھ سکیں۔ لیکن حضرت احسن کو ان ناکامیوں کی مطلق پروا نہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خاص لوگوں نے ضرور اُن کی قدر کی ہے اور کریں گے۔ اور بقولِ سودا:-

مرے سخن کی مرے بعد زیادہ ہووے قدر   گہرِ یتیم جو ہووے تو ہو فزود بہا

کسی زمانے میں "نقاد" وغیرہ پرچوں کی "مغربیت" کا بڑا چرچا ہوا تھا اور اس کے لئے علوم انگریزی کے نیم ملاؤں نے خوب ہاتھ پاؤں مارے تھے لیکن حضرت احسن نے شروع ہی سے

اُسے "فریب فکر و نظر" سمجھ کر اُردو شاعری کے ماحول کے منافی خیال کیا تھا اسی لئے اُس کے خلاف اُنہوں نے صحیح طور پر قلم اٹھایا تھا لیکن افسوس کہ مہدی مرحوم جیسے بزرگ ادیب بھی "ذاتیات" کا "تبرا" پڑھنے لگے۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر مجبوراً حضرت احسن سے بھی ایک آدھ جگہ بے اعتدالی ہوگئی تو وہ "تقاضائے بشریت" سے زیادہ کچھ اور نہیں تھی۔ کیونکہ جنہوں نے اُن کی صحبت اٹھائی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود اپنے بزرگوں یعنی مولانا عبدالجلیل بلگرامی، مولانا آزاد بلگرامی، حضرت شاہ ابوالبرکات مارہروی اور حضرت صاحب عالم مارہروی کی طرح کتنے پاک باطن، شریف النفس، منکسر المزاج اور سراپا اخلاق تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک صحبت میں باہر کے ایک مشہور ادیب بعض طلبہ سے کہنے لگے کہ ابتذال اور سوقیانہ پن لکھنؤ کی شاعری میں پایا جاتا ہے لیکن دہلی اس سے پاک ہے حضرت احسن موجود تھے اُن کی صداقت پسندی اس جملے کو برداشت نہیں کر سکی حالانکہ اُن جیسا دہلی کا مقلد کون ہوگا؛ فوراً وہ دہلی کے شعراء کا مبتذل کلام سنانے لگے۔ غالب کے بھی دو شعر تھے:۔

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

پھر ذوق، مومن اور داغ وغیرہ مشاہیر شعرائے دہلی کے اشعار بھی سنائے۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایسا زبردست حافظہ اور ایسی حاضر جوابی کیسے اُن کے حصے میں آئی تھی۔ غرض کہ اِن واقعات کو "حق گوئی" سے تعبیر کیجئے یا اور کچھ سمجھ لیجئے لیکن یہ بالکل حقیقت ہے کہ حضرت احسن بہت پاک باطن اور بے ریا بزرگ تھے۔ مشہور ہے کہ مصحفی تنگ دستی کی وجہ سے اپنی اچھی سے اچھی غزلیں بھی فروخت کرکے اپنا گذارہ کرتے تھے۔ سرور جہاں آبادی کو بھی مجبوریوں نے اسی طرح گھیر لیا تھا۔ افسوس کہ زندگی کی ایسی کٹھن گھڑیاں کبھی کبھی حضرت احسن کو بھی پیش آئیں اور انہیں بھی مجبوراً اپنی بعض تصانیف فروخت کرنی پڑیں۔ چنانچہ کم از کم اُن کی دو اعلیٰ ادبی کتابیں ضرور ایسی ہیں جن کی آج کل ادبی حلقوں میں بہت شہرت ہے لیکن اصل مصنف کا نام پوشیدہ ہے۔ بہرحال جن حضرات کو

حضرت احسن کی زبان اور طرزِ تحریر سے واقفیت ہے وہ ان کتابوں کے چند صفحے پڑھ کر خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

نمونۂ منثورات (حصہ اول) بھی اپنی مالی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لئے لکھی گئی تھی۔ لیکن حسب منشا داد نہ ملنے کی وجہ سے اُس کا دوسرا حصہ ہمیشہ کے لئے رہ گیا۔ جن لوگوں نے واقعی اس جیسے کام کئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سینکڑوں کتابوں کو کھنگالنے میں کتنی محنت اٹھانی پڑتی ہے اور یہ محنت اُس وقت کتنی بڑھ جاتی ہے جب کہ قلمی کتابوں سے واسطہ ہو اور کم از کم ساڑھے پانچسو سال کے سلسلے وار نمونے پیش کرنے ہوں اور ساتھ ہی تنقید اور تبصرہ بھی جامع و مانع ہو۔ ابھی تک ہندوستانی زبانوں میں اس طرز کی اور کوئی کتاب نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ جب تک تاریخ نثر اُردو لکھنے لکھانے میں ادبار کی کوششیں جاری رہیں گی اُس وقت تک حضرت احسن کی یہ کتاب ہمیشہ قدر و منزلت سے دیکھی جائے گی۔ لیکن شرط یہی ہے کہ اُس کا بغور مطالعہ کیا جائے اور محض سرسری نگاہ ڈال کر اُس پر فتویٰ صادر نہ کیا جائے۔

چند پریشانیوں کی وجہ سے حضرت احسن کی کتاب "شبیہ داغ" بھی رہ گئی جو دراصل "جلوۂ داغ" (۱۸۹۹ء) کے سلسلے کی دوسری کڑی تھی اور "یادگار داغ" کے بعد ہی جس کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں اُنھوں نے "انتخاب کلام داغ" بھی مرتب کیا جو غالباً اب طبع ہو رہا ہے۔ اُسکے متعلق اُنھوں نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۰ جولائی ۳۸ء میں مجھے تحریر فرمایا تھا کہ "اس انتخاب میں یہ التزام ہے کہ فارسی عطف و اضافت نہیں ہے۔" "انشار داغ" بھی اپنے تاریخی نام کے ساتھ ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں شائع ہو جاتی لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ نیز رامپور میں حضرت داغ کے کچھ اور خطوط کا پتا چلا اس لئے حضرت احسن نے وہاں کا رُخ بھی کیا اور وہ کتاب ابھی تک ہماری نظروں سے چھپی ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ جلد چھپ جائے۔

حضرت داغ کے شاگردوں میں صرف حضرت احسن ہی ایسے تھے جنھوں نے تمام عمر اپنے استاد کے نام کو قائم رکھنے کے لئے پوری کوشش کے ساتھ قلمی جہاد کیا۔ حالانکہ وہ خود

فرماتے تھے کہ "حضرت داغ اپنی شاعرانہ نام وری میں کسی ایک شاگرد کے محتاج نہیں ہوئے"۔
یہ واقعی حقیقت ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وقتاً فوقتاً جن حضرات نے فصیح الملک کی رنگینی اور شوخی
پر حرف گیری کی جرارت کی اُن کا جواب پوری طرح حضرت احسن نے دیا اور خاموش کر دیا۔ اِس
کی وجہ دراصل یہی تھی کہ حضرت احسن نے ایک عرصے تک اپنے استاد کی خدمت میں رہ کر انکی
شاعری اور ذاتی حالات کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اُن کی ہر اونچ نیچ سے بذاتِ خود واقف
تھے۔ استاد بھی اپنے مخلص شاگرد کی دل سے قدر کرتے تھے اور اُن کی ذاتی قابلیت سے
متاثر تھے۔ ایک قطعے کی فرمائش پر لکھتے ہیں :۔

سید احسن جو مرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں — جن کو اللہ نے دی فکرِ رسا، طبع رسا
شعر کے حسن و قبائح جو اُنھوں نے پوچھے — اُن کی درخواست پہ اک قطعہ یہ برجستہ کہا

حضرت داغ نے لفظ "دوست" رسمیہ نہیں استعمال کیا تھا بلکہ کچھ اصلیت بھی رکھتا تھا اور
یہ عجیب محبت تھی کہ جس کی بنا پر حضرت احسن کے تمام خواجہ تاش اُن سے بہت عزت و احترام کے
ساتھ ملتے تھے اور حضرت احسن بھی ان حضرات سے اس خلوص کے ساتھ ملتے تھے کہ حقیقی بھائیوں کی
محبت بھی شاذ و نادر ایسی ہوتی ہے۔

حضرت داغ کی صحبت میں رہ کر حضرت احسن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کی وجہ دراصل
یہ تھی کہ شعرار کا کلام جب اصلاح کے لئے آتا تھا تو استاد کی اصلاحات کو اکثر حضرت احسن ہی اپنے
قلم سے لکھتے جاتے تھے اور عموماً جواب بھی خود ہی لکھا کرتے تھے اس لئے انھیں تمام اصلاحات کا
بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور محض اسی وجہ سے اُن کے کلام میں بھی استاد جیسی پختہ کاری
نظر آتی ہے یعنی کہنہ مشقی کے باوجود وہ بہت زیادہ احتیاط برتتے تھے۔ اور اگر کوئی خاص عجلت
ہوتی تھی تو بے شک جلد لکھ لیتے تھے ورنہ عموماً بہت زیادہ غور و فکر کے بعد لکھتے تھے اور جب
تک اچھے الفاظ ذہن میں نہ آتے تھے ہرگز شعر نہیں لکھتے تھے۔ مجھ سے خود انھوں نے بعض مرتبہ
فرمایا کہ "دیکھو یہ مضمون ذہن میں آیا ہے لیکن دو تین روز ہوئے ابھی تک شعر میں ضم نہیں ہوسکا"۔

یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں بھرتی کے الفاظ بالکل نہیں ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ حضرت احسن کے یہاں حضرت داغ کے جذبات، خیالات، شوخی اور رنگینی بہت کم ہے لیکن یہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے یہاں زبان کی خوبی کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بندش اور ترکیب کی چستی اتنی زیادہ ہے کہ ذرا سا ردّ و بدل بھی محال ہے۔ اسی لئے امید ہے کہ اُن کا کلام شائع ہو جانے پر مستند زبان کا ایک بیش بہا خزینہ ثابت ہو گا۔ ایک اور چیز جو حضرت احسن کی تحریر میں شروع ہی سے دیکھی جاتی ہے وہ اُن کا املا رتھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۲۳ء سے اصلاح املا رکی طرف توجہ مبذول کی اور با قاعدہ اس کے لئے مختلف اہل قلم نے کوششیں کیں لیکن جو چیزیں ان حضرات نے قائم کیں وہ بہت پہلے (سوائے چند مستثنیات کے) حضرت داغ کی صحبت میں حضرت احسن نے قائم کر لی تھیں اور اُن پر ہمیشہ سے عمل بھی کرتے تھے۔

لیکن جو چیز حضرت احسن کی خاص تھی اور جسکی وجہ سے میں اُن کا گرویدہ ہوا وہ انکی زبان تھی۔ وہ اگر آزاد کی چٹخارہ دار لطافت اور چاشنی سے لبریز تھی تو ساتھ ہی موجودہ زمانے کی سلاست سے بھی رواں تھی اور مولوی عبد الحق صاحب کی طرح ہندی کے میٹھے میٹھے اور فصیح الفاظ سے بھی پُر تھی! افسوس ہے کہ وقت کی قلّت کی وجہ سے اُن کی اس اعلیٰ خصوصیت کو میں ابھی زیادہ واضح نہیں کر سکتا ورنہ بتا دیتا، کہ اس محسنِ اُردو کی ۵۴ سالہ ادبی خدمات میں یہ چیز کتنی زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ بہرحال جن اہل ذوق حضرات نے اُن سے گفتگو بھی کی ہے اُن کو ضرور اعتراف ہو گا کہ اُنکا ہر جملہ "زرِ کامل عیار" کی شان رکھتا تھا اور ایک ایک لفظ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ٹکسال کے نئے نئے سکے ہیں جو ڈھل ڈھل کر نکلتے جا رہے ہیں اور سامع میں اگر ذوقِ سلیم ہوتا تھا تو اُن الفاظ کی لطافت سے بغیر لطف اٹھائے نہیں رہ سکتا تھا عجیب شان تھی، عجیب بزرگ تھے۔ آہ! کیسے یقین کر لوں کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں؟ کمبخت دل کو تو صبر آتا ہی نہیں۔

آہ ایسا بزرگ جس کی تمام عمر ادیبوں کی صحبت میں گذری، جس نے تمام عمر اُردو کی خدمت کی، جس نے اپنے استاد فصیح الملک کی ہر اعتبار سے جانشینی کی، آج ہماری نظروں سے اوجھل ہے! دعا ہے کہ اللہ پاک اپنی رحمت کاملہ سے اُس بزرگ ہستی کو جنّت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اُس کی قبر کو ہمیشہ پُر نور رکھے۔ آمین ثم آمین۔

مولانا احسن بحیثیت مضمون نگار اور انشا پرداز

جناب مبشر علی صاحب صدیقی ایم ۔اے۔ بی۔ٹی (علیگ)

احسن مارہروی اُردو کے مایہ ناز شاعر ہی نہ تھے بلکہ نثر میں بھی ان کی خدمات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ مولانا ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے خواہ نظم ہو یا نثر۔ اسکول اور کالج کے بیسوں انتخاب مولانا کے قلم کے رہین منت ہیں اور ان میں سے تقریباً ہر ایک پر مولانا نے دیباچہ لکھا ہے۔ دوسرے شعرا کے کلیات نظم پر بھی انہوں نے مقدمات لکھے ہیں۔ اُردو کے اکثر رسائل مثلاً ہمایوں۔ ادبی دنیا۔ علی گڑھ میگزین وغیرہ مولانا کے مضامین سے مزین ہوتے رہتے تھے لیکن ان کا نثر میں سب سے بڑا کارنامہ کلیات ولی کا دیباچہ (جو ۴۰ صفحات پر محیط ہے) اور تاریخ نثر اُردو موسوم بہ منثورات ہے۔ اس ضمن میں "منتخب داغ" کے مقدمہ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کی یہ تینوں تصانیف تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی ہیں اور اُردو نثر اور ان شعرا پر تحقیق کرنے والے ہمیشہ ان سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ ہم ذیل میں ہر ایک پر تفصیلی بحث کریں گے۔

ولی کو آزاد اُردو شاعری کا باوا آدم بتاتے ہیں اُن کا خیال ہے "اس زمانہ تک اُردو میں متفرق شعر ہوتے تھے۔ ولی کی برکت نے اسے وہ زور بخشا کہ آج ہند کی شاعری فارسی شاعری سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ تمام بحریں فارسی کی اُردو میں لائے۔ شعر کو غزل اور غزل کو ردیف اور قافیے سے سجایا۔ ردیف وار دیوان بنایا۔ ساتھ اس کے قطعہ، مخمس، رباعی کا میدان بھی نکلا۔ انہیں ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چوسر کو، عربی میں مہلل کو اور فارسی رودکی کو"۔ جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ اُردو نظم کا آغاز ولی سے بہت پہلے دکن میں ہو چکا تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ کو محقق پہلا صاحب دیوان شاعر بتاتے ہیں۔ لیکن اس سے ولی کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انہوں نے اُردو نظم میں غزل کو پہلی مرتبہ چمکایا اور

بحیثیت ایک صنف کے اختیار کیا۔ اس میں انہوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ باید و شاید۔ اِس مشہور شاعر کے دیوان کا کوئی مستند نسخہ موجود نہ تھا۔ بازاری نسخے اغلاط سے پُر تھے۔ غزلوں کی ترتیب میں اختلاف تھا۔ احسن مرحوم نے کمال محنت اور وقت صرف کر کے ایک مستند نسخہ ولی کے دیوان کا مرتب کیا۔ ۴۰ صفحات کا دیباچہ لکھا۔ فرہنگ، ضمیمہ اور قطعات تاریخ کا اضافہ کیا۔ قدیم نسخوں کو از سرِنو ترتیب دینے میں، اغلاط کی تصحیح کرنے میں اور متعدد اشعار کا مختلف نسخوں میں مقابلہ کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اُنھیں ریسرچ کرنے والے خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ مولانا احسن مرحوم اور انجمن ترقی اُردو کی بدولت کلیات ولی یہ جامع اڈیشن منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا اور ریسرچ کرنے والوں نے اُسے سر آنکھوں پر جگہ دی۔ لیکن تحقیق کا راستہ اتنا دشوار گذار ہے کہ یہاں چالاک سے چالاک رہرو ٹھوکر کھا جاتا ہے اور مولانا سے بھی کلیات کے مرتب کرنے میں کئی جگہ لغزشیں سرزد ہوئیں ہیں۔ ان کے کارنامہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مولانا کے معتقدین کو معلوم ہونا چاہیے کہ مشاعرہ کے لئے دس پانچ اشعار موزوں کر لینا اور بات ہے اور کسی قدیم شاعر کے دیوان کا صحیح نسخہ ترتیب دینا اور بات۔ ولی کے کلام میں دکھنی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، اِن الفاظ کا املا بھی آج کل کے املا سے مختلف ہے، بعض الفاظ اب متروک ہو گئے ہیں۔ اور بعض کی صورت بدل گئی ہے۔ مولانا کو یا تو دکھنی زبان سے زیادہ دلچسپی نہ تھی یا وہ اِسے اہم نہ سمجھتے تھے، اسی لئے کلیات میں کئی ایک خامیاں رہ گئیں اور مولوی عبدالحق صاحب کو انہیں کئی ضمیمے اور فرہنگ اضافہ کرنے کے بعد دور کرنا پڑا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے اعتراضات مندرجہ ذیل ہیں٭۔

(۱) جب کتاب چھپنی شروع ہوئی اور بعض مقامات پر مجھے شبہ ہوا اور میں نے اِن مقامات کو اپنے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اختلاف نسخ اس سے کہیں زیادہ ہے جو جناب احسن نے اپنے نسخوں میں دکھایا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ولی کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جو احسن صاحب کو دستیاب نہیں ہوا اور اِن نسخوں میں موجود ہے۔ اس لئے کتاب کے ساتھ دو ضمیمے شامل کرنے کی ضرورت پڑی۔

٭ کلیات ولی "التماس" از مولوی عبدالحق۔

(۲) احسن صاحب نے اس کا خیال نہیں کیا کہ مختلف الفاظ کا اختلاف کتابت کی غلطی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ ان کو وہ اشعار لکھنے چاہئیے تھے جو ایک سے زیادہ نسخوں میں پائے جاتے ہیں حالانکہ ایسے نسخے بھی لئے جا سکتے ہیں جو صرف ایک ہی نسخے میں ہیں مگر ان سے یا تو شعر کا مفہوم بلند ہو جاتا ہے یا قدیم زمانہ کی ترکیب معلوم ہوتی ہے اور قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ حقیقت میں یہی لفظ ہوگا مگر بعد میں سہو کتابت سے کچھ کا کچھ ہو گیا۔

(۳) اگر جناب مرتب صاحب قدیم املا کی پابندی فرماتے تو بہت اچھا ہوتا مثلاً (اوپر) کو جہاں "واؤ" ادا نہیں ہوتا ہے بلا واؤ لکھا ہے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اصل نسخوں میں بھی ایسا ہی ہوگا مگر ایسا نہیں ہے۔ (خورشید) کو بلا واؤ لکھا ہے حالانکہ اب تک اس کا املا "واؤ" سے جاری ہی گو بلحاظ لغت بلا "واؤ" ہی صحیح ہے۔ ستین، ستی، ہستی کو ہر جگہ ایک ہی صورت سے (ستی) لکھا ہی (ھات) کو (ہاتھ) (کون) کو (کو)، (وو) کو ہر جگہ (وہ) (یو) کو (یہ) (تون) کو اکثر جگہ (تو) لکھا ہے۔

(۴) مرتب صاحب کے انتخاب سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کونسی غزل کس نسخہ میں ہے؟

(۵) الحاقی غزلوں میں اور ایسی غزلوں میں جو تمام نسخوں میں پائی جاتی ہیں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

(۶) مثلاثی، چار در چار، بازگشت وغیرہ ان نسخوں میں غالباً نہ ہونگے جو احسن صاحب کے پیش نظر تھے۔

غرضکہ مولوی عبدالحق صاحب اور احسن مرحوم کی مشترکہ کوششوں سے کلیات ولی کا ایک مکمل اور صحیح نسخہ مرتب ہو گیا جو ولی پر تحقیق کرنے والوں کے لئے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام کرے گا۔ احسن نے دیباچہ ۱۰۴ صفحات کا لکھا ہے اور مختلف عنوانات مثلاً ولی کے نام، اُن کی جائے پیدائش،

ان کی شاعری وغیرہ قائم کرکے سیر حاصل بحث کی ہے۔ مولانا کو اس دیباچہ کی تیاری میں بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا جن کی انہوں نے فہرست بھی دیدی ہے۔ ان کا دوسرا کارنامہ تاریخ نثر اُردو یا منثورات ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں اُردو نثر کے جو ادوار قائم کئے ہیں اُن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں مولانا کے قائم کردہ ادوار سے ہی نہیں بلکہ ہر ایک ادیب کے قائم کردہ ادوار سے ایک حد تک اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اُردو نثر کے ادوار قائم کرتے وقت اس بات کو مدِنظر رکھنا چاہئے کہ ہر ایک دور کی ممتاز خصوصیات رجحانات اور میلانات کیا ہیں اور دو قریب کے ادوار میں کونسی باتیں مشترک اور نمایاں ہیں جو انہیں علیٰحدہ کرتی ہیں۔ مولانا نے ہر ایک نثر نگار کی تصانیف میں سے مناسب اقتباسات پیش کئے ہیں! اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ سرسری طور پر پڑھنے والے کو بھی ایک نظر میں اُردو نثر کی تدریجی ترقی اور ارتقا معلوم ہو جاتا ہے۔ مولانا نے اس کتاب کے مرتب کرنے میں کوئی تحقیق نہیں کی ہے بلکہ اُنہی نثر نگاروں کو لے لیا ہے جنہیں سب جانتے ہیں اور جن کی تصانیف آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ جدید دور کے نثار بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اقتباسات میں مولانا نے یہ اچھا کیا ہے کہ چند خطوط کے نمونے بھی شامل کر دئے ہیں۔ ان کی تنقید سے بھی بیشتر اختلاف کیا جائے گا۔ لیکن بحیثیت مجموعی مولانا کی یہ تالیف اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

اُردو نثر میں مولانا کا تیسرا کارنامہ "منتخب داغ" کا مقدمہ ہے۔ "منتخب داغ" دو حصّوں میں تقسیم ہے، حصہٗ اوّل میں فصیح الملک مرزا داغ کی غزلوں کے بکثرت ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جو فارسی عطف اور اضافت سے خالی ہیں۔ اس جدّت کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی حالانکہ مولانا نے مقدمہ میں لکھا ہے "آج کل سارے ہندوستان میں اُردو ہندی کا جھگڑا دوبا اور بلا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اُردو کو فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے بچانا چاہئے .... راقم الحروف ۳۰ - ۴۰ برس سے اُس کا موید ہے اور اگرچہ ادبی اور علمی تصانیف کے لئے عموماً دوسری زبانوں اور خصوصاً عربی و فارسی کے بغیر اُردو کلاسیکل زبان نہیں بن سکتی پھر بھی

عام بول چال کے لئے تمام ملکی خیر خواہوں کی طرح خصوصیت سے ہر شاعر کا فرض ہونا چاہئے کہ جہاں تک اس کے امکان میں ہو اپنی زبان کو سہل سے سہل اور آسان سے آسان ترکیبوں کے ساتھ استعمال کرے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو فارسی کے سائے میں بڑھی اور پلی ہے اور یہ بھی مسلّم ہے کہ فارسی کی اضافتوں اور ترکیبوں سے اُردو کی بندشوں میں چستی اور بیان میں لطیف اختصار پیدا ہو جاتا ہے جس کی بدولت زبان کی دل کشی اور دلاویزی بڑھ جاتی ہے لیکن موجودہ خیالوں کی تائید کے لئے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اگر اُردو کو فارسی ترکیبوں سے بچانے کی کوشش کی جائے اور عادت ڈالی جائے تو اس صورت میں بھی اُردو اتنی کامیاب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی ترکیبوں کا سہارا لئے بغیر اپنا مطلب پوری طرح اور اسی انداز کے ساتھ ادا کر سکتی ہے، جس طرح کہ ایک ترقی پائی ہوئی زبان سے اُمید کی جا سکتی ہے"۔ ہمارے خیال میں مولانا اگر ہندی اُردو، ہندوستانی کی بحث میں نہ پڑتے تو اچھا ہوتا لیکن اس کا انہیں اعتراف ہے کہ فارسی تراکیب نکالنے سے اُردو کے حسن میں فرق آجائے گا۔ داغ کی زبان بہت سلیس ہے اور مولانا اس قسم کے اشعار منتخب کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں لیکن ہر ایک شاعر کے یہاں ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مولانا غالب اور اقبال کے ایسے اشعار منتخب کرتے جو عطف اور اضافت سے خالی ہوں تو انہیں شدید ناکامی ہوتی حالانکہ عوام میں یہ دونوں شاعر داغ سے زیادہ مشہور ہیں۔ بات یہ ہے کہ فارسی ترکیبیں اور اضافتیں اُردو میں گھل مل کر ایسی ہوگئی ہیں کہ اب انہیں علیحدہ کرنا دانائی نہیں۔ اس زبان کی ساخت اور نزاکت میں فرق آتا ہے۔ دوسرے حصّہ میں ایسی غزلیات کا انتخاب کیا گیا ہے جو فارسی عطف اور اضافت سے خالی نہیں۔ انتخاب داغ کے چاروں دیوانوں میں سے ہے اور مولانا نے کوشش کی ہے کہ صرف معیّاری اشعار منتخب کئے جائیں۔ مولانا کو داغ کی صحبت میں رہنے کا عرصہ تک اتفاق رہا اگر وہ ایسی غزلیات کا انتخاب کرتے جو داغ کے ذہنی ارتقا کا پتہ دیتیں تو اچھا ہوتا۔ اس کے علاوہ مقدمہ میں مولانا نے داغ کی مختصر لیکن جامع سوانح عمری بھی دی ہے، داغ کے متعلق بعض مضامین میں سے اقتباسات اور

چند تبصرات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی مقدمہ تشنہ رہ گیا ہے اور مولانا اگر چاہتے تو بہت کچھ لکھ سکتے تھے۔ اس میں نوری کی کتاب کی طرح نہ جزئیات پر بحث کی گئی ہے اور نہ قادری کے مقدمہ کی طرح داغ کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔

مولانا نے کالج کے طلبا کے لئے نظم و نثر کے کئی انتخاب مرتب کئے تھے۔ ان میں سے "حسن الاد" اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ انتخاب مسلم یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کے طلبا کے لئے شائع کیا گیا تھا۔ ایک ناقد کا خیال ہے کہ "فاضل مولف نے عمدہ اور معیاری کلام انتخاب کیا ہے اور حواشی پر جگہ جگہ مشکل لفظوں، محاوروں اور تلمیحوں کی تشریح و تفصیل بھی کر دی ہے۔ انتخابی غزلوں اور نظموں کے عنوانوں کے ساتھ ہی ہر غزل اور ہر نظم کا وزن عروض بھی لکھدیا ہے۔ ایک علیحدہ باب میں عروض، بیان اور بدائع کی ابتدائی اور ضروری معلومات بھی درج کر دی ہیں۔ ہر شاعر کے مختصر سوانح اور اس کے کلام کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں"۔ یہی ناقد آگے چل کر لکھتے ہیں "لیکن کہیں کہیں ان سے لغزشیں ہو گئی ہیں جن کا ایک کہنہ مشق ادیب، شاعر، اور استاد سے سرزد ہونا تعجب سے خالی نہیں۔ مثلاً "ندان" کے متعلق فاضل مولف کی تحقیق یہ ہے کہ "نادان" کا مخفف پرانی زبان ہے اب نہیں بولتے"۔ میر کا شعر ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ؎

ہستی مری کہ ہیچ تھی، میں منفعل رہا اس شرم سے ندان زمین میں سما گیا

ندان ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بالآخر، انجام کار کے ہیں۔ اسی طرح "چسنا" کے متعلق لکھا ہے "چسنا غالباً چسپاں ہونے سے مراد ہے اب یہ لفظ نہیں بولتے"۔ میر کا شعر ہے ؎

چھلے ہیں مونڈھے، پھٹی ہے کہنی، چسے ہی چولی پھٹنے ہی بھری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ آیا

چسنا بھی ہندی زبان کا فعل ہے۔ جس کے معنی کپڑے کا تنگ اور چسپت ہونے کے سبب پھٹنا اور چاک ہونا وغیرہ ہیں"۔ لیکن اس قسم کی دو چار غلطیاں نکال دینے سے مولانا کے کارنامہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم نے ان کے بیشتر انتخابات دیکھے ہیں، وہ آج کل کے انگریزی پڑھے ہوئے

حضرات (جو عربی کا تو ذکر کیا فارسی بھی کچھ یونہی سی جانتے ہیں) کے مرتب کئے ہوئے انتخابات سے کہیں زیادہ جامع اور صحیح ہیں۔

مولانا اکثر تقاضوں سے تنگ آکر اُردو رسالوں کے خاص نمبروں کے لئے مضامین لکھتے تھے۔ ہم چند اہم مضامین کا ذکر کریں گے۔ آج جب کہ مولانا مرحوم کی برسی کے موقعہ پر اُن کی یادگار میں علی گڑھ میگزین کا احسن نمبر شائع ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی اس اپیل کا اعادہ کیا جائے جو انہوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان "اُردو رسائل زبان کی کس طرح خدمت کرسکتے ہیں" میں کی ہے۔ یہ مضمون مرزا بشیر الدین محمود احمد کے ایک مضمون کی تائید میں لکھا گیا ہے جس میں مولانا نے مرزا صاحب کی ان تجاویز سے اتفاق کیا ہے جو انہوں نے اُردو زبان کی ترقی اور بقا کے لئے تجویز کی ہیں۔ خدا ہم لوگوں کو توفیق دے کہ ہم مولانا کی مجوّزہ تجاویز* پر عمل کرسکیں۔

(۱) تمام حضرات سے اُمید کی جائے کہ جب کبھی کوئی سوال (۱) اُردو لغت کے متعلق (۲) نحوی قواعد کے متعلق (۳) بعض علمی خیالات کے ادا کرنے میں زبان کی دقتوں کے متعلق (۴) محاورات کے متعلق (۵) تذکیر و تانیث اور جمع کے قواعد کے متعلق (۶) بظاہر مترادف نظر آنے والے الفاظ کے متعلق (۷) پرانی اصطلاحات کی تشریح یا نئی اصطلاحات کی ضرورت کے متعلق پیدا ہو تو بجائے خود حل کرکے خود ہی اس سے لطف حاصل کرنے کے وہ اس سوال کو رسالے کے ادبی کلب کے حصے میں شائع کرائیں۔

(۲) ایسے لغت کی ضرورت ہے جس میں نہ صرف دہلی و لکھنؤ یا شمالی ہند کے الفاظ جمع کئے جائیں بلکہ اس جزیرہ نما کے تمام صوبوں کا سرمایہ لفظی تاکہ جملہ مترادفات اور مفردات یکجا نظر آنے لگیں۔ اس کا نتیجہ اس کے علاوہ کہ تمام ہم معنی الفاظ بآسانی معلوم ہو جائیں یہ بھی ہوگا کہ

---

*مندرجہ تجاویز مولانا کے مضمون سے اخذ کی گئی ہیں جو "ادبی دنیا" کے نوروز نمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔

بہت سی اصطلاحیں بہت سے اسما جو ایک صوبے میں نہیں بولے جاتے اور ان کے لئے مجبوراً غیر زبانوں سے بھیک مانگی جاتی ہے، اپنے دیس کی بولیوں میں ملجائیں گے اور اس طرح اُردو کی بے مائیگی بہت کچھ کم ہو سکے گی۔

(۳) قواعد کے متعلق اب تک جتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں دو خامیاں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اُردو کے قواعد خالص اُردو کے قواعد نہیں کہے جاسکتے اوّل یہ کہ اکثر عربی وفارسی اور انگریزی صرف و نحو کا اس قدر تتبع کیا گیا ہے کہ اُردو گرامیر دوسری زبانوں کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ نحوی ترکیب کے لئے تمام اصطلاحیں عربی زبان کی استعمال کی جاتی ہیں، وہ اُردو داں طالبان علم جن کو ابتدا سے انگریزی تعلیم دی جاتی ہے مبتدا، خبر، فاعل، مفعول، متعلقات فعل اور جملہ انشائیہ وخبریہ اور فجائیہ ومستانفہ کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ فی الحال ادبی دنیا میں ایک کالم مخصوص رکھا جائے جس میں قواعد اُردو کے مسائل عام فہم اُردو میں اُردو ترجمے کے ساتھ لکھے جایا کریں اور بآسانی ممکن ہو تو اُردو اصطلاحیں بنائی جائیں۔ اس خصوص میں ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانے میں جو قواعد کی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ پیش نظر رہنی چاہئیں کہ ان میں اکثر قریب الفہم انداز میں قواعد بیان کئے گئے ہیں نیز میر انشا اللہ خاں کی کتاب دریائے لطافت* کا ترجمہ شائع کیا جائے۔ یہ کتاب اگرچہ بہت پیچیدہ عبارت اور منتشر ترتیب کی حامل ہے پھر بھی اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اُردو قواعد کی بنیاد دوسری زبانوں سے علیحدہ قائم کی گئی ہے۔

(۴) اُردو میں تذکیر و تانیث کا ایسا الجھیڑا ہے کہ کسی طرح سلجھائے نہیں سلجھتا۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت نے ہمارے اطفال کو اُردو سے بالکل نابلد کر دیا ہے۔ اور پھر انگریزی لٹریچر کی بدولت جس رسمی معلوماتِ عامہ کا سلسلہ چھڑ گیا ہے اس نے ہر مغربی تعلیم یافتہ کو برخود غلط مجتہد بنا دیا ہے۔

---

* اس کتاب کا ترجمہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے کیا ہے اور انجمن ترقی اُردو سے شائع ہو چکی ہے۔

اس طبقہ کو نہ مرکزی زبان کی پرواہ ہے نہ کسی صاحب فن کی تقلید کا خیال ہے اُن کا تو مقولہ یہ ہے کہ مفہوم ادا کر دیا جائے صحت زبان ہو یا نہ ہو، وہ اس قضیئے کو کہ فلاں لفظ مذکر ہے یا مؤنث نزاعِ لفظی اور فضول بات سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس بنا پر کوئی امید نہیں معلوم ہوتی کہ موجودہ واقفانِ فن کے بعد تذکیر و تانیث کا کوئی معیار قائم رہ سکے گا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس معاملے میں اہل الرائے غور و فکر کے بعد تحفظ زبان کی خاطر ایسی حد بندی کا سامان کریں جس کو آیندہ دستور العمل بنایا جا سکے۔

ہم نے اب تک مولانا کے ان مضامین کو پیش کیا ہے جن میں عموماً زبان اور شعر و ادب کے متعلق تحقیقی اور تنقیدی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے دوسرے عنوانات پر طبع آزمائی نہیں کی۔ مثال کے طور پر مولانا اپنا جسٹس محمود کے ساتھ پہلی مرتبہ ملنے کا واقعہ ایک مضمون* میں اس طرح بیان کرتے ہیں: "غالباً ۱۸۹۰ء کا مذکور ہے کہ راقم الحروف کسی ضرورت سے علی گڑھ آیا ہوا تھا۔ لٹن لائبریری میں سید افتخار عالم مرحوم مؤلف حیاۃ النذیر جو رشتے میں میرے چچا تھے ملازم تھے اور سیّد ابن محمدؒ بلگرامی جو میرے قریبی عزیز ہیں کالج میں پڑھتے تھے۔ اس سلسلے سے میرا قیام کالج ہی میں ہوا۔ جسٹس سیّد محمود مرحوم ہائی کورٹ کی ججی سے استعفا دے کر علی گڑھ آ چکے تھے اور اکثر یہیں مقیم رہتے تھے۔ سنا گیا ہے کہ وہ معمولاً بعد مغرب کالج کا گشت لگایا کرتے تھے، کبھی کسی طالب علم کے کمرے میں کبھی کسی معلّم کے پاس بے تکلف بیٹھ جاتے تھے اور گھنٹوں اپنے لطائف و ظرائف سے محظوظ و مستفیض کرتے رہتے تھے۔ لڑکوں کے ساتھ اکثر بیت بجتی کا سلسلہ چھڑ جاتا تو آدھی آدھی رات تک چھڑا رہتا اور کسی مولوی کے کمرے میں پہنچ جاتے تو مختلف علمی مباحث شروع ہو جاتے اور جب تک سننے والے اکتا اکتا کر اِدھر اُدھر نہ ہو جاتے وہ خود اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ سیّد محمود کے مذہب کے متعلق اسی مضمون میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: "سیّد افتخار عالم مرحوم مؤلف حیاۃ النذیر نے باتوں باتوں میں کہا کہ ایک مرتبہ میں پٹنہ گیا۔

---

* "جسٹس محمود کے ساتھ دو گھنٹے" مطبوعہ علی گڑھ میگزین جنوری ۱۹۳۰ء۔

چند نوجوانوں کے مجمع میں آپ کا تذکرہ ہو رہا تھا انھیں باتوں میں آپ کے مذہب کی بابت بھی گفتگو شروع ہو گئی۔ ایک صاحب بہت وثوق سے کہہ رہے تھے کہ سیّد محمود شیعہ ہیں، میں نے اس کی تردید کی۔ یہ سن کر پوچھنے لگے تو آپ نے میرا مذہب کیا بتایا۔ انہوں نے کہا کہ سنّی۔ تنبیہانہ انداز سے کہنے لگے کہ تم نے بھی غلط کہا۔ اب اگر تم سے کوئی پوچھے کہ محمود کا مذہب کیا ہے تو کہنا "شمس تبریزی" یہ کہکر حسب ذیل شعر جو غالباً حضرت شمس تبریزی کا ہے دردناک لہجے میں اثر انداز طریقے سے پڑھا۔

نمی دانم زمنع گریہ مطلب چیست ناصح را
دل از من دیدہ از من آستیں از من کنار از من

دیکھئے سیّد محمود مولانا اور ان کے ساتھیوں سے مارہرہ کی چٹنی کی فرمائش کس طرح

کرتے ہیں:۔

"بیٹھنے کے بعد جو پہلی بات ہم سے مخاطب ہو کر پوچھی وہ یہ تھی کہ آپ لوگوں کی سیکنڈ لینگویج ، Second Language) کیا ہے جواباً عرض کیا کہ ہم یہاں کے طالب علم نہیں۔ یہ سن کر فرمایا اچھا آپ مہمان ہیں، فرمائے وطن کہاں ہے۔ کہا گیا کہ مارہرہ۔ فرمایا وہ مارہرہ جہاں کی چٹنی مشہور ہے۔ عرض کیا کہ جی ہاں۔ پھر پوچھا کہ آپ کمبوہ ہیں۔ بتایا کہ نہیں۔ سادات کے خاندان سے ہیں یہ سن کر مسکرائے اور کہا کہ اچھا آپ تو ہمارے بھائی نکلے۔ حسب ونسب کے متعلق دو ایک معمولی باتیں پوچھکر فرمانے لگے کہ آپ اب کے آئیں گے تو ہمارے لئے مارہرہ کی چٹنی کا ایک کلھڑ لائیں گے۔ عرض کیا گیا کہ ضرور۔ فرمایا' دیکھئے آپ وعدہ کر رہے ہیں (مولانا خلیل احمد اور اپنی طرف اشارہ کر کے کہا) شاہدین عادلین موجود ہیں ایسا نہ ہو کہ ایفائے عہد نہ کیا جائے۔ مولانا مزاح نگار نہ تھے لیکن اکثر جگہ مزاح پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو" اسی طرح جب دو شاعر ہستیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد جانبین سے سخن رانی کی فرمائش کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور تکلّفاتی انکار و اصرار کی نقاب کشائی کے ساتھ باہم اصلی حرف وحکایت کا آغاز کیا

جاتا ہے۔ اس ضمن میں واہ وا اور ماشاء اللہ کی داد وستد ہوتی ہے وہ "من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو" کی شرح د فرہنگ سمجھنا چاہئے۔ مولانا جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے صاحب طرز نہ تھے لیکن ان کا طرز تحریر سلجھا ہوا، رواں اور شگفتہ تھا وہ عربی و فارسی کے دقیق الفاظ استعمال کرکے ناظرین پر خواہ مخواہ رعب ڈالنا نہ چاہتے تھے۔ حالانکہ اکثر جگہ ان کی عبارت میں "الفاظ زیادہ اور مطلب کم" کا مضمون ہے لیکن پڑھنے والے کو نفس مضمون تک پہونچنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ غرض کہ مولانا احسن مرحوم خاندان سادات میں سے تھے، سجادہ نشین تھے، پیری مریدی کا سلسلہ تھا، غزلوں اور نظموں پر اصلاح دیتے تھے، ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا، خود ایک کامیاب غزل گو شاعر تھے اور اس کے علاوہ ایک نثر نگار!۔

از ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی

کیا واقعۂ غم کا کہیں کیا دردِ جاں فرسا کہیں
کیا حالِ نا زیبا کہیں کیا کیا لکھیں کیا کیا کہیں
اے احسن مارہروی

نے لطف رنگِ دہر ہے اندھیر اس کی لہر ہے
امرت کے بدلے زہر ہے جو سانس ہے وہ قہر ہے
اے احسن مارہروی

سرگرم سوز و ساز تھا خوش وضع و خوش انداز تھا
چاروں طرف اعزاز تھا تو خلق میں ممتاز تھا
اے احسن مارہروی

تو شاعرِ شیریں زباں تو نکتہ فہم و نکتہ داں
تو سرگروہِ این داں تو فخرِ اربابِ جہاں
اے احسن مارہروی

تو پاک دل عالی نظر تو نیک خو والا سیر
تو با مراتب ذی اثر تو بیش تر تو خوب تر
اے احسن مارہروی

ہر بات میں اک بات تھی نی نفسہٖ بالذات تھی
سعی عمل دن رات تھی بے مثل تحقیقات تھی
اے احسن مارہروی

اللہ رے حسنِ ادب مضمون فرد و منتخب

کاوش غضب بندش عجب   قائل ہیں اسکے سب کے سب

اے احسن مارہروی

حشمت بھی تھی تیرے لئے   شہرت بھی تھی تیرے لئے
عزت بھی تھی تیرے لئے   وقعت بھی تھی تیرے لئے

اے احسن مارہروی

جشن دکن بھولا نہیں   پھرتا ہے آنکھوں کے قریں
دل چسپ دل کش دل نشیں   غزلیں کہیں غزلیں نئیں

اے احسن مارہروی

استاد قبلہ کا کرم   چشم عنایت دم بدم
وہ دن تھے کتنے مغتنم   اک سمت تو اک سمت ہم

اے احسن مارہروی

سچی ہدایت تو نے کی   ظاہر حقیقت تو نے کی
جلسوں میں شرکت تو نے کی   اُردو کی خدمت تو نے کی

اے احسن مارہروی

الفت سے بلوانا ترا   الطاف فرمانا ترا
یاروں کو تڑپانا ترا   دنیا سے اٹھ جانا ترا

اے احسن مارہروی

مضطر فلک ششدر زمیں   اک غمزدہ اور اک حزیں
بے شبہ بے شک بالیقیں   یہ موت معمولی نہیں

اے احسن مارہروی

اُجڑا ہمارا پھولا چمن   باقی نہیں پچھلی پھبن
مغموم اہلِ علم و فن   سونی ہوئی بزم سخن

اے احسن مارہروی

بدلا نظامِ آسماں　　سر پر گرا کوہِ گراں
موجود ہیں خرد و کلاں　　لیکن وہ مارہرہ کہاں
اے احسن مارہروی

برسوں علی گڑھ میں رہا　　کالج سے تیرا واسطا
چرچا ہے جس کا جابجا　　ایسا شرف حاصل کیا
اے احسن مارہروی

نورِ معانی کی چمک　　رنگین بیانی کی جھلک
دل سے نہ جائے گی کھٹک　　روئیں گے تجھ کو حشر تک
اے احسن مارہروی

کوئی نہ دیواں چھپ سکا　　ارمان باقی رہ گیا
پیش آیا طرفہ ماجرا　　واحسرتا واحسرتا
اے احسن مارہروی

مصروفِ غم پیر و جواں　　دل میں قلق لب پر فغاں
ڈھونڈینگے تجھ کو قدرداں　　پائیں گے لیکن اب کہاں
اے احسن مارہروی

ہوتی رہے آٹھوں پہر　　رحمت کی بارش تیری پر
فردوس میں پاکر و فر　　اللہ دے رہنے کو گھر
اے احسن مارہروی

یہ قول سن کر نوحؔ کا　　طوفاں ہوا غم کا بپا
روتا رہا کہتا رہا　　ہم رہ گئے تو چل دیا
اے احسن مارہروی

قصرِ احسن پر دو دن

(از مولانا ضیاء القادری بدایونی)

ہو مبارک احسنؔ اب نو واردوں کو بزمِ یار
دوستدارانِ کہن اُٹھتے ہیں جانے کے لئے

مارہرہ کی مقدس سرزمین جس میں واسطی بلگرامی برکات کے جلیل القدر اچھے ستھرے نوری مجسمے صرف استراحت ہیں کمال آفرینی کے لئے ہمیشہ مخصوص و ممتاز رہی۔ اسی ارض مسعود نے برکاتی خانوادہ کو دو صدی پیشتر سے مرجع فیوض و برکات بنایا روحانیات کے روشن ستارے اسی مبارک خطہ سے چمک چمک کر آسمان رشد و ہدایت کے آفتاب و ماہتاب بنے۔ اسی تابش آفریں بستی کا ایک نوری وجود دور آخر میں احمد نوری کے روحانی خطاب سے جہان معرفت کے ہر گوشہ میں مشہور ہوا۔ اسی جنت نشان قصبہ کا دوسرا برگزیدہ صاحب کمال مجتبےٰ حسن محبوب ذوالجلال کے باب رحمت سے دولت لازوال متاع فضل و کمال لیکر عازم وطن ہوا مگر بمبئی کی خاک نے اس برکاتی پیکر آب و گل کو مکی مدنی تجلیات کے ساتھ ہمیشہ کے لئے دست قضا سے لے لیا اور یہ خدا رسیدہ برگزیدۂ افاضل انسان ۹ ربیع الاول ۱۳۱۱ھ کو واصل بحق ہوکر بمبئی ہی میں آسودۂ خواب عدم ہوگیا۔ لیکن اپنے برکات علم و فضل کا وہ احسن مرقع اپنی یادگار چھوڑا جو اہل نظر کے نزدیک عنوانِ احسن تقدیم بنا۔

حضرت شاہ علی احسن صاحب علیہ الرحمتہ جو ارباب عقیدت میں شاہ میاں صاحب اور دنیائے ادب میں احسنؔ صاحب مارہروی کہلائے اسی بابرکت مارہرہ میں ۲۲ شوال ۱۲۹۳ھ کو پیدا ہوئے بزرگ باپ مقدس اکابر کے آغوش میں پروان چڑھے آستانہ برکاتیہ نہ صرف فیوضِ معرفت و طریقت کا مرکز تھا بلکہ علوم دینیہ کی مکمل درسگاہ بھی تھا آپ نے تحصیل و تکمیل کے مدارج نہیں طے فرمائے۔ کمالات علمی پر فطری مذاق غالب آیا۔ سخن سنجی و سخندانی کا رنگ نکھرا۔

ذوقِ سلیم نے فن شعر کو جزو طبیعت بنا دیا اور بہت جلد آپ مجالس شعرا میں خصوصی نظم کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔

جہاں استاد بلبل ہندوستان نواب فصیح الملک حضرت میرزا داغ دہلوی کے رشتہ تلامذہ میں منسلک ہوئے نصف صدی تک ادبی خدمات شفقت کامل کے ساتھ انجام دیں۔ مشاہیر اساتذہ کے پہلو بہ پہلو مشاعروں میں معرکتہ الآرا غزلیں پڑھیں۔ میدان شاعری میں ندرت تخیل اور سلاست زبان کے سکہ بٹھائے۔ نظم و نثر میں تصانیف کے انبار لگائے۔ مسلم دارالعلوم علیگڑھ میں عرصہ تک اُردو زبان داں کی حیثیت سے۔ تشنگاں ادب کو سیراب فرمایا۔ آخر زبان حال سے کہنا ہی پڑا۔

ہو مبارک احسن اب نوواردوں کو بزم یار
بندہ و متدارانِ کہن اوٹھتے ہیں جانے کیلئے

کس کو خبر تھی کہ احسن دنیائے سخن کے ندیم رفقا کو اپنی نغمہ ریزیوں کے دھن میں رخصتی ساز کے پردے میں۔ ایک جگر سوز پیام دے رہا ہے۔ اور نوواردوں کو بزم ادب کی شرکت کی دعوت دے رہا ہے۔

جب کسی نے ان کی محفل میں نہ پوچھی میری بات
درد دل اوٹھا بہ مجبوری اوٹھانے کے لئے

آہ یہ شکوہ۔ محفل سخن کسی غیر کی محفل نہ تھی تو ہی رونق محفل تھا تیرے ہی دم قدم سے ادبی مجالس میں چہل پہل رہتی تھی۔ تیرے سامنے کس کو مجال دم زدن تھی۔ شرکا بزم کی خموشی حاضرین محفل کا سکوت تو یقیناً تیرے ادب و احترام کا مظاہرہ تھا۔ یہ قیاس کہ خدانخواستہ تیری جانب نگاہ التفات نہیں ہے۔ کس کو یقین ہو کہ صحیح ہے۔ یہاں تیرے ضمیر کی آواز تو خود ہی تیرے درد دل کی ترجمان ہے۔

زندگی میں موت سے غافل نہ ہونا چاہئے
اس زمانہ کو نہ بھولو اس زمانے کے لئے

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تجھے بزم گیتی سے اوٹھانے کے لئے مجبور کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ تو خود نشاط زندگی کی عیش آفریں فضاؤں میں موت کی ہلاکت خیزیوں سے بے خبر نہ تھا دورحیات میں بیا دورفنا تیرے سامنے تھا۔ تجھسے تعلق خاطر اس لئے نہ تھا کہ تو دامن جھٹک کر اس قدر جلد اہل مجلس کو خدا حافظ کہکر اوٹھ کھڑا ہو گا۔

یہ نہ سمجھے تھے کہ ہم روتے رہیں گے عمر بھر　　　　دل لگایا تھا فقط ہنسنے ہنسانے کے لئے

مجھے ۸-۹ اپریل ۱۹۴۰ء کے دو دن عمر بھر یاد رہیں گے جو احسن کے دولت کدہ پر احسن کے خیالات احسن سے مستفید ہونے میں گذرے۔ وہ تبسم آمیز لب ولہجہ وہ خندہ پیشانی وہ خلق و مدارات کا اظہار خدا شاہد کہ بھولے سے بھی خیال نہ ہوتا تھا کہ اس مبارک صحبت کو عمر بھر رونا پڑے گا۔ اور آج قصر احسن میں لطائف وظرائف پر ہنسنا ہنسانا برسوں خون کے آنسو رولائے گا اور یہ ملاقات آخری ملاقات ہو گی۔

ضیار بے نوا علی گڑھ سے بدایوں واپس ہو رہا تھا اسٹیشن پر مولانا عبدالحامد صاحب سے ملاقات ہوئی ہاتھرس جنکشن پر مولانا نے فرمایا حضرت شاہ میاں صاحب کی زیارت کو جی چاہتا ہے بجائے کاسگنج کے مارہرہ شریف اتریں شاہ میاں کی ملاقات اور آستانہ پاک پر حاضری ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہو گی۔

میں نے عرض کیا چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار۔ لطف محبت اور جوش عقیدت ارمان آرزو بنکر کشاں کشاں مارہرہ لے آئے میزبان نے ناخواندہ مہمانوں کا خیر مقدم جس بزرگانہ شفقت و محبت سے کیا اس کا اظہار تحصیل حاصل ہے۔ دوپہر کا وقت گرمی کی شدت اس پر مہمان نواز صاحب خانہ کی گرم جوشانہ تواضع۔ نواردوں کو پانی پانی کئے دیتی تھی۔ کتب خانہ میں ٹہرایا گیا شام کو کھانے کے بعد اصرار ہوا۔ تازہ کلام سناؤ تعمیل ارشاد میں جو کچھ ممکن ہوا عرض کیا۔ اپنے کلمات عالیات سے بھی مستفیض فرمایا۔ زیادہ رات تک مختلف مباحث پر گفتگو رہی اسی دوران میں احباب و مخلصین سے یہ بھی ارشاد ہوتا رہا کہ بھئی مولانا اور ضیا حسن اتفاق

سے آگئے ہیں صبح کو آستانہ میں میلاد شریف کا اعلان کر دیا جائے۔ مہمان نوازی کا یہ پر کیف رنگ کہ مہمانوں کے مذاق تخیل کا لحاظ بھی اور دوسروں سے تعارف کرانے کا خیال بھی اس سے زیادہ موزوں ہو ہی نہیں سکتا۔ مہمان ہیں کہ دل ہی دلمیں اپنی ضروریات کو یاد کرتے ہیں مگر بقول حضرت ممدوح۔

تعلق آشناں یار سے چھوڑا نہیں جاتا　　چلا جاتا ہوں میں لیکن دل شیدا نہیں جاتا
یہ محویت ہے دل کی یا تری محفل کی دلچسپی　　یہاں ہم بیٹھ جاتے ہیں تو پہرا وٹھا نہیں جاتا

کہیں مولانا اپنی ضروریات کا اظہار کرکے واپسی کی اجازت چاہتے ہیں فرماتے ہیں مدتوں میں آتے ہو اتنی جلد واپسی میری دل شکنی ہوگی۔ آپ نے تو فلاں مقام پر وعدہ کیا تھا کہ آئندہ جب مارہرہ آؤں گا تو دو دن رہوں گا۔

شکست عہد پر آمادہ وہ ہر وقت رہتے ہیں
مگر ٹوٹے ہوئے دل کو کہیں جوڑا نہیں جاتا

مولانا میری طرف دیکھتے ہیں تو میں احسن کی تلطف آمیز نگاہیں دیکھ کر دل ہی دلمیں کہتا ہوں۔

جب آیا ان کا پیکاں لیگیا تاب و تواں دلکی
یہ مہماں میزبان کے پاس سے تنہا نہیں جاتا

مولانا چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کی ہمنوائی کروں اور اجازت و ما دوت حاصل کروں مجبوراً میزبان کی نگاہِ التفات دیکھ کر میزبان کی زبان سے کہنا پڑتا ہے۔

وہ تیر ناز جو پنہاں چلائے جاتے ہیں
نظر کے سامنے دلمیں سمائے جاتے ہیں

اجازت نہیں دی جاتی گاڑی چھوڑنا پڑتی ہے خوب شاہ میاں کتب خانہ کی بالائی منزل پر اور میں نیز مولانا زیریں برآمدہ میں شب کو قیام کرتے ہیں۔ رات کے پچھلے حصہ میں ایک

زاہد شب بیدار کی طرح میزبان کو جو بحیثیت ایک شاعر یا احسن مارہروی کے دنیا میں روشناس ہے ہم نے عبادت الٰہی میں مصروف پایا۔

صبح کو معمولات سے فارغ ہو کر مہمان اور صاحب خانہ پھر باہم گر ملے۔ خیال پیدا ہوا کہ شب کی جلوہ پاشیوں سے ایک ہلکی سی تجلی اپنے دامنِ نگاہ کے لئے مستعار حاصل کروں مگر فوراً ہی دل نے بتایا کہ احسن تو پیشتر ہی فرما چکا ہے۔

جلوہ اُن کا عام کیوں ہوتا زمانے کے لئے
حسن کی دولت نہیں ہوتی لٹانے کے لئے

میری حاضری آستانہ بر کاتیہ پر ایک سائل آشفتہ حال ایک طالب جلوۂ جمال کی حیثیت سے تھی۔ زبان پر مائل سوال ہوئی جی چاہا عرض کروں لاکھ تجلیات شب دوشنبہ عام نہ تھیں مگر مہمان سے پردہ بھی تو مہمان نوازی کے شایانِ شان نہیں۔

ترے جلوہ کو ہم اے جلوہ گر سمجھیں کیوں پردہ
دکھایا جا رہا ہے وہ مگر دیکھا نہیں جاتا

یہ تخیل بھی آن کی آن میں آیا گیا ہو گیا ۔ سوچا اگر حرف التجا زبان پر آ گیا تو وہ فرمائینگے۔

نہ کیوں ہو محویت جلوہ میں رقابت گم
وہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی

کچھ دیر تک میں انھیں خیالات میں مستغرق رہا۔ آخر میزبان کے اس مطمح نگاہ اور معیار تقسیم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

دیرا اور حرم اور خدا اور صنم اور
پھر کون کہے کس سے کہ تم اور نہ ہم اور

سلسلہ گفتگو شروع ہوا ہی تھا کہ چائے اور ناشتہ کا خوان آ گیا۔ میزباں کی جانب سے لطف سے نہایت کے ساتھ تواضع و مدارات کا اظہار زائد سے زائد شغل خور و نوش کا اصرار

ہوتا رہا۔ فارغ نہ ہوئے تھے کہ آستانہ سے خدام آگئے۔ چلئے مجلس تیار ہے۔ یہ فقرہ سنا اور سب کے سب درگاہ معلی کو چلدئے۔ زمین بوسی کے بعد فاتحہ پڑھی۔ نگاہوں نے مقابر مقدسہ کا طواف کیا۔ حضور اچھے صاحب قدس سرہٗ کے اکرام و عطایا اپنے ہر شایق جمال کی دستگیری کے خوگر ہیں میں نے بھی سرکار میں عرض کر دیا۔

بنکر ہمہ تن چشم بنے آئینہ تیرا　　　حسرت نزے مشتاق کی اس سے نہیں کم اور

مجلس جمع ہو چکی تھی حکم ہوا ضیا صاحب پڑھئے۔ حکم سنکر کاٹو تو نہیں لہو بدن میں۔ میں خشک ہو گیا کہ یا اللہ آستانہ مقدسہ پر کیونکر جراُت کروں۔ کمزور وضعیف و ناتواں ہوں۔ کس طرح تخت پر بیٹھوں کیسے زبان کھولوں۔ دوبارہ حضرۃ قبلہ مہدی میاں صاحب دام ظلہم نے حکم دیا۔ الامر فوق الادب چار و ناچار چوکی پر بیٹھ گیا۔ سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ شاہ میاں نے ارشاد فرمایا۔ پڑھئے۔

مقام حمد ہے بزم جمال میر میخانہ

یہ مصرعہ اس عاجز کی ایک غزل کے مطلع کا دوسرا مصرعہ ہے غزل پہلے روز شام کو میں حضرت ممدوح کے سامنے پڑھ چکا تھا۔ غرض پڑھنا شروع کیا۔ برابر حکم پر حکم ہوتا تھا کہ

دم لینے نہ دیں گے تری عیسیٰ نفسی کو　　　باقی ہیں ہزاروں ابھی مجھسے لب دم اور

میں حضرت احسن کا شعر بیباکانہ انداز میں غیر محل لکھ گیا کہاں میں مریض جاں بلب کہاں عیسیٰ نفسی مگر اس کو کیا کہئے کہ حضرت کے اصرار پیہم کا مفہوم بھی تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ میں نے کیوں کر پانچ غزلیں بھری مجلس میں پڑھ لیں۔ اگر ایک طرف دو محترم بزرگ حکم دینے والے تھے تو دوسری طرف اکابر آستانہ کا تعرف روحانی قوت پہونچا رہا تھا۔ میرے بعد مولانا حامد میاں صاحب کا وعظ حاضرین کے لئے معلومات ملی کا بہترین درس تھا۔ جو دیر تک جاری رہا۔

محفل کے ختم کے بعد ہم دولت کدہ پر حاضر ہوئے دوپہر کا کھانا کھایا۔ دست بستہ اجازت سفر چاہی بہر ہزار دشواری استدعا قبول ہوئی۔ سواری منگائی گئی دروازہ کے باہر تک مہمانوں کو

پہونچانے تشریف لائے۔ جاتے جاتے چشم سخنگو نے آواز دی۔

دم وداع دے گھر سے جب وہ جاتے ہیں　　قیامت آتی ہے اس دن سحر نہیں ہوتی

ہم نے جبیں نیاز جھکائی دست بوسی کر کے اسٹیشن کی راہ لی۔

یہ محبت یہ لطف محبت آج یاد آتا ہے　　اور میں فرط غم سے کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں

احسن مارہروی شعراء کے طبقہ میں کامل فن اور ماہر فن کا مرتبہ حاصل کر چکے تھے آپ کی فنی معلومات اس درجہ وسیع تھیں کہ دور موجودہ کے ارباب بصیرت آپ سے استفاصہ اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ اگرچہ آپ کی استادانہ شخصیت مسلم تھی تاہم بعض تنگدل اظہار اختلاف کی حدود سے باہر طعنہ زنی پر بھی امادہ نظر آتے ہیں۔ آپ نے طعنہ نار وا پر کبھی اپنے تشخص کا اعلان نہیں کیا۔

کمال بے ہنری سے غنی ہوں میں احسن
مجھے ضرورت عرض ہنر نہیں ہوتی

معاصرین کے اختلافات پر بھی آپ نے ہمیشہ سکوت ہی فرمایا۔ لیکن آپ کی طبع نازک ان اختلافات سے اثر انداز ضرور ہوئی۔ اور آپ کو دبی زبان سے کہنا ہی پڑا۔

آج کل احسن دروغ و رشک وغیبت کے سوا
رہ گئی ہیں اور کیا باتیں سخندانوں کے پاس

آخر دور حیات میں آپ کی طبیعت میں مشیت الٰہی کا رنگ غالب تھا لیسا اوقات گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے۔

تیرے دیوانوں کا آبادی میں جی لگتا نہیں
بستیاں ان کی بسا کرتی ہیں ویرانوں کے پاس

جس طرح معمر انسان کی فطرت موت کے تصور کو ہر وقت آئین نظر بنائے رہتی ہے آپ بھی ان تاثرات سے فارغ نہ تھے۔ آپ کے جذبات پنہاں کی ترجمانی آپ کے کلام میں موجود ہے۔

وہاں یہ حضرت دل بے بلائے جاتے ہیں　　جہاں بلائے ہوئے بھی اٹھائے جاتے ہیں

ٹھہر ٹھہر کے چل او جلد باز عمر رواں
رواروی میں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

نمود حشر نمایش ہے بھولے بھٹکوں کی
تمام عمر کے بچھڑے ملائے جاتے ہیں

دوسری غزل میں ارشاد فرماتے ہیں۔

ہماری عمر کی گھڑیاں تو گھٹتی جاتی ہیں
نہ ہو۔ جو ہجر کی شب مختصر نہیں ہوتی

اجل کو روکئے کیا کہکے اُن کے آنے تک
کہ اب تو بات بھی اے چارہ گر نہیں ہوتی

یہی جذبات اشعار ذیل میں بھی کارفرما ہیں۔

لائے ہو جنازہ تو مجھے دفن بھی کردو
اٹھے ہیں جہاں چار قدم ایک قدم اور

ڈوبی ہوئی نبضیں ہیں تو اکھڑی ہوئی سانسیں
کر لیجئے بیمار سے باتیں کوئی دم اور

احسن در قاتل سے تو خود اُٹھ نہیں سکتا
پہنچائیں اُٹھا کر اسے تا حدِ عدم اور

آخر کے یہ تین شعر اگرچہ موت سے سات سال بیشتر کہے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایفا والہام کی کیفیات شاعر کے قلب پر شدنی واقعات کے نقوش بنارہی تھیں۔ عہد ماضی کا کلام زمانہ حال کے لئے پیشنگوئی کا حکم رکھتا ہے۔

حضرت احسن کی تندرستی بظاہر اچھی تھی یکایک مرض کا غلبہ ہوا۔ پٹنہ علاج کے لئے تشریف لے گئے جہاں آپ کے ایک صاحبزادے ڈاکٹر ہیں۔ شفاخانہ ہی وہاں کا در قاتل ثابت ہوا۔ وہیں اپنے داعی اجل کو لبیک کہا۔ پٹنہ جانا دراصل دوراز وطن فرزند سے باتیں کرنے کا ارمان تھا۔ بیمار سے جنازہ لانے والے شریک دفن ہوئے یا نہیں اس میں شک نہیں کہ احسن باب اجل سے خود نہ اُٹھ سکا اس کو حدودعدم تک پہونچانے والے دوسرے ہی تھے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون اس فقیر کے پاس عزیز محترم سعید احسن صاحب نے حضرت مغفور کی چھ غزلیں روانہ فرمائیں اور اولین فرصت میں مضمون کی فرمائش کی کل ۱۱ر دسمبر کو مجھے لفافہ ملا مصائب و افکار پیہم کے باعث دل و دماغ عرصہ سے نذر بے کیفی ہیں۔ کل ہی حضرت نظامی صاحب کی خدمت میں

ذوالقرنین پریس میں حاضر ہوا کلیات ولی جو حضرت احسن صاحب کی مرتبہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوئی ہے حاصل کی۔ تاریخ نثر اُردو اس وقت دستیاب نہیں ہوسکی آج صبح غزلیں دیکھیں تبصرہ کی طرف توجہ کی قلم اُٹھایا تو کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ نہ تبصرہ رہا نہ تنقید اشعار سند واقعات بن گئے۔

کہہ گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

فقیر ضیا القادری غفرلہ

۱۲ر دسمبر سنہ ۴۳ء بدایوں

مولانا احسن مرحوم کے چند خطوط

بنام ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مارہرہ ضلع ایٹہ (یو۔پی) ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

مجی وشفیقی۔ تسلیم خلوص تفخیم

آپ کا علی گڑھ (کانفرنس جوبلی میں) تشریف لانا اور میرا چند منٹ کے لئے ملنا ایک خواب دیکھنا تھا اس وقت اس خیالی گفتگو سے قطع نظر اس خواب کی تعبیر چاہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اثنائے گفتگو میں آپ نے فرمایا تھا کہ میرے پاس مرزا داغ مرحوم کے دو ایک خط یا رقعے موجود ہیں۔ اور میں نے استدعا کی تھی کہ اس کی نقل مجھے عنایت کیجیے۔ آپ نے وعدہ فرمالیا تھا مگر میں اپنی غفلت سے اب تک نہ چونکا سکا۔ اب مرزا مرحوم کے خطوط مرتب کر چکا ہوں جس کا تاریخی نام (انشائے داغ) ہے، یہی ۳ مہینے ہیں کہ وہ پریس جا کر اس تاریخی نام کو بیکار نہ ہونے دے لہذا امیدوار کہ حسب ارشاد ایک دو یا جتنے خطوط یا رقعے مل سکیں مرحمت ہوں اگر ممکن ہو تو نواب عزیز جنگ بہادر سے میرا اسلام نیاز فرما کر ان سے بھی حاصل کیجیے۔ اوران کے اگر کوئی پتا اور جناب کو معلوم ہو تو اس سے مطلع کیجیے۔ میں بہت شکر گذار ہوں گا۔ اگر اس ادبی یادگار میں جناب میرے مددگار ہوں گے۔

آپ کی تازہ تالیفات کے اشتہار دیکھتا ہوں مگر پھر بھول جاتا ہوں اگر آپ کسی گوشۂ فہرست میں میرا نام ٹانک لیں اور جب کوئی تازہ تالیف ہو مجھے بھجوا دیں تو ممنون ہوں گا فی الحال روح غالب میں دل پڑا ہوا ہے۔ فضل باری سے امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔ والسلام۔

آپ کا مخلص

احسن مارہروی

خط ۲۔ بنام راگھو و ندر راؤ صاحب جذب وکیل عالم پور

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۰ر مارچ ۱۹۳۵ء

لطف فرمائم۔ تسلیم

رباعیات جذب کی رجسٹری دو چار روز ہوئے پہنچی۔ پھر والا نامہ دستیاب ہوا۔ کرم بالائے کرم کا منت پذیر و شکر گزار ہوں۔ "اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی" عنایت نامے میں جواب کے لئے لفافہ رکھنے کی ضرورت نہ تھی آپ کی اتنی عنایتوں کے بعد پاسخ نگاری میرا فرض تھا۔ اگر آپ یاد دہانی نہ فرماتے تو بھی نیاز نامہ حاضر ہوتا مگر شاید دو چار روز کی دیر ہو جاتی۔ مجھے آپ نے شہنشاہِ تبصرہ خطاب دیکر اچھی شاعری کی ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے صلہ میں تقریظ لکھوں یا تنقید کروں۔ فطرت انسانی تو یہی چاہتی ہے کہ مصنف کی تعریف ہی تعریف کی جائے مگر قوتِ ایمانی یہ کہتی ہے کہ انسان کو فرشتہ نہ بنایا جائے اس لئے مختصراً بے لاگ عرض کرتا ہوں۔ آپ کی یہ خدمت ہرگز بے سود نہیں بلکہ سراپا بہبود ہے۔

آپ کی رباعیاں آپ کے تخلص کے لحاظ سے جذباتی رباعیاں ہیں۔ علم النفس کے مطابق اکثر احساسات واردات قلب کا آئینہ ہیں۔ موزوں اور مناسب الفاظ میں بہترین مضامین اور دل نشیں معانی بیان کیے گئے ہیں۔ اُردو زبان ایسی خدمات کی مستحق ہے اور آپ نے خدمت اُردو کے لئے پسندیدہ اقدام فرمایا ہے پیرایۂ بیان اور سادگی زبان قابل تعریف ہے۔

میں نے آپ کی سب رباعیاں پڑھیں اور دلچسپی سے پڑھیں۔ محاسن بہت زیادہ اور معائب بہت کم ہیں۔ جتنے اسقام میری کوتاہ نظری سے دوچار ہوئے ان میں بھی اکثر سہو کاتب یا روانیِ قلم کا گمان ہوتا ہے۔ دو ایک شماری فرد گذاشتیں ایسی ہیں جنہیں بشریت کا تمغا کہا جا سکتا ہے جس سے از آدم تا ایندم کوئی فرد خالی نہیں باقی ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست۔

مثلاً صفحہ (۹۸) میں پری خانہ اور عزا خانہ کا قافیہ محل غور ہے یا صفحہ (۹۹) کی رباعی کے دوسرے مصرع میں تم مخاطب (تم) اور مصرع چہارم میں غائب (وہ) مخل فصاحت ہے۔ اس طرح اگر قدیم اساتذہ کی پیروی میں پابندی قواعد لازمی سمجھی جائے تو صفحہ (۸۳) کی رباعی کے قوافی رشکِ لالہ (بحالت ترکیب فارسی) اور کالا کالا توجہ کے لایق ہیں بس ایسے چند نمونے قابل گرفت ہیں ورنہ تمام و کمال مجموعہ تحسین و داد کا مستحق ہے۔

اگر میرے برادر کرم فرما حضرت سخا سے ملاقات ہوتی ہو اور آپ کو یاد رہے تو سلام شوق فرما دیجئے گا۔ والسلام

دعا گوئے انام

احسن بدنام

بنام مولوی غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے (علیگ)
پروفیسر کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۵ر اپریل ۳۰ء
۴ر مارسن روڈ

اعزی واحبی۔ السلام علیکم

۱۸ر اپریل کے کارڈ کا جواب لکھ رہا ہوں۔ کلیم صاحب کا کوئی خط مجھے اس وقت تک نہیں ملا۔ ایک زمانہ تھا کہ کلیم نے ارنی کہہ کر لن ترانی جواب میں سنا تھا اب کلیم کے مشتاق وہی جواب سنتے ہیں۔ یہ قدرت کے تماشے ہیں ان سے کہدیجئے گا کہ میں بہر حال دعا گو ہوں اور رہوں گا۔

برخوردار کی طبیعت ہنوز ناصاف ہے اور اب وہ بغرض علاج لکھنؤ گئے ہوئے ہیں میرا معاملہ توسیع ہنوز طے نہیں ہوا۔ نئے وائس چانسلر ہی ابھی آ دھر میں ہیں تا بدیگراں

چہ رسد دیکھئے کس کل اونٹ بیٹھے ؎

رات دن چکر میں ہیں سات آسماں ؛ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

میں انشاء اللہ ۲؍مئی کو مارہرے چلا جاؤں گا۔ آپ کی ہمشیر کی علالت کا حال سنکر تعلق خاطر ہے دعا ہے کہ شافی مطلق شفائے کامل دعاجل عطا فرمائے۔

ولی کے متعلق اور ردقصۃ الشہداکی بابت جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کے جواب کے لئے میرے پاس وقت نہیں یہ بڑی فرصت کی باتیں ہیں پھر دیکھا جائے گا لیکن اتنا سمجھ لیجئے کہ ولی کے ہم تخلص ان سے آگے پیچھے کئی شاعر گذرے ہیں۔ اس لئے کسی تحقیق پر وثوق کامل نہیں۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ ۱۱۶۲ھ سے بہت پہلے گذر چکے ہیں۔ والسلام

دعاگو

احسن

بنام صفیر جلال آبادی

مارہرہ۔ ضلع ایٹہ ۴؍اکتوبر ۳۹ء

عزیزم السلام علیکم۔ رات خواب میں نہیں، جاگتے میں بہت دیر تک آپ کا خیال رہا اس کی جاگتی تعبیر یہ ملی کہ اس وقت آپ کا خط ملا۔ میں بحمد اللہ بخیریت ہوں کثرت کار اور شدتِ انکار سے البتہ متردد رہتا ہوں مگر اس کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ اس لئے اس کا تذکرہ فضول ہے۔

میں ۲۔ ۳ روز کے لئے علی گڑھ چلا گیا تھا کل واپس ہو کر معلوم ہوا کہ میرے دوست فاروق حسن صاحب اپنے فرزند کے دیکھنے کو مظفر نگر گئے ہیں سنا گیا ہے کہ وہ علیل ہو کر شفاخانے میں داخل ہیں اگر موقعہ ملے اور معلوم ہو سکے تو کچھ حالات لکھے جائیں

بحالت تکلیف و تکلف زیادہ کاوش نہ کی جائے۔

دائم اور مریض دونوں اسم فاعل ہیں ان دونوں کا بقاعدہ عربی (با دخال الف لام) استعمال صحیح نہیں۔ دائم المرض۔ دائم الحبس۔ دائم الخمر صحیح ہے۔ دائم الصوم کی جگہ دائم الصام۔ دائم النوم کو دائم النائم کہنا غلط ہے۔ دونوں اسم فاعل اس طرح مرکب نہیں ہوسکتے۔ امید ہے کہ مزاج عزیز بخیر ہوگا۔ نگینے کے مشاعرہ میں نہیں جاؤں گا اور اب رمضان شریف تک شعر و شاعری کا سلسلہ یک قلم موقوف رہے گا۔ والسلام

دعاگو

احسن

اصلاح احسن مرحوم کے شعروں پر

فصیح الملک حضرت داغ مرحوم
کی جو ۱۹۰۱ء میں دی گئی۔

شعر حضرت احسن مرحوم

اصلاح ۔ آتا ہے

دیکھنے کے لئے آیا ہے زمانہ اس کو　　　　اک تماشا ہے مسافر بھی سفر سے پہلے

اس شعر میں صرف یہ اصلاح فرمائی حضرت داغ نے کہ بجائے آیا ہے کے آتا ہے بنا دیا
آیا ہے نے" آنے والوں کی آمد کو ختم کر دیا اور آتا ہے میں آنے والوں کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی
تماشا وہی عمدہ ہوتا ہے جس کے مشتاق بڑھتے چلے جائیں۔

شعر حضرت احسن مرحوم

اصلاح جا پڑا تھا

کسی دن بیخودی میں جا پڑے تھے ان کے سینے پر
بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلے میرے پتھر سے

اصلاح کچلا

اس شعر میں کچلے کی جگہ کچلا اور جا پڑے تھے کی جگہ جا پڑا بنایا گیا جس سے حالت بیخودی
پورے طور سے ثابت ہوگئی ورنہ حالت بیخودی میں دونوں ہاتھوں کا جا پڑنا عین ہوشیاری سمجھی جاویگی۔

شعر حضرت احسن مرحوم

نہیں اٹھتیں نہیں ملتیں نہیں کھلتیں آنکھیں　　　　شرم ہے نشہ ہے یا نیند تمہیں آئی ہے

اس کو یوں درست فرمایا ؎

نہیں کھلتیں نہیں اٹھتیں نہیں ملتیں آنکھیں

جب آنکھ کھل گئی تو اس کے لئے اٹھنا بھی لازمی ہے اور جب اٹھی تو غلط بھی ضروری ہے۔

احسن بحیثیت استاد

محمد رضا علی خاں ایم اے ایل ایل بی (علیگ)
ایڈوکیٹ ہائی کورٹ (الہ آباد) - جے پور

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

مولانا سے غایبانہ تعارف تو مجھے عرصہ سے تھا لیکن ۲۴ء میں جب علی گڑھ پہنچا تو ان کی خدمت میں دو سال گذارے۔ غایبانہ تعارف اس طرح ہوا کہ میرے ایک قریبی عزیز جو انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتے تھے جب تعطیلات میں وطن واپس آتے تو علی گڑھ اور وہاں کے اساتذہ کے حالات سناتے ان میں تین بزرگوں سے وہ زیادہ متاثر تھے اول محترمی جناب عبدالمجید صاحب قریشی (پرنسپل سابق انٹرمیڈیٹ کالج) موصوف کی شفقت اور ہمدردی کا ان پر بہت اثر تھا ساتھ ہی ان کے ڈسپلن سے خائف تھے۔ عبدالعزیز صاحب پوی کے بھی مداح تھے ان کے طرز تقریر اور شگفتہ مزاجی کا بھی اکثر ذکر رہتا تھا۔ تیسری ذات مولنا کی تھی۔ مولنا کا ذکر اس وقت ہوتا جب وہ کسی مشاعرہ کا حال سناتے یا ان پر خوشی کا دور ہوتا۔ مشاعرہ کے سلسلہ میں مولنا کی دلچسپی اور انہماک کا ایسے ستھرے اور دلنشیں انداز میں ذکر چھیڑتے کہ مولنا ہمارے سامنے چلتے پھرتے معلوم ہوتے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ ۳۴ء میں مجھے اور برادر گرامی حشمت حسین صاحب کو علی گڑھ آنا پڑا۔ میں نے قانون اور ایم۔اے میں داخلہ لیا۔ حشمت صاحب کو تعلیمات سے خاص مناسبت تھی اس لئے انہوں نے شعبۂ تعلیم (بی ٹی) میں داخلہ لیا اور اپنی فطری قابلیت اور ذہانت کا نمایاں ریکارڈ یونیورسٹی میں چھوڑ آئے۔ ایم۔اے میں اردو لینے کے کچھ بھی اسباب ہوں لیکن یہ ضرور تھا کہ مجھے عرصہ سے استادی محترمی رشید احمد صاحب صدیقی سے خاص عقیدت تھی دوسرے

مولانا کی کشش بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ یہاں غالباً داخلہ کی مہم اس کے صبر آزما اور حوصلہ شکن مراحل کا ذکر تو بیموقع ہو گا۔ یہ سمجھ لیجئے کہ کسی طرح داخلہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب فضا میں سکون ہوا تو اُردو ڈپارٹمنٹ میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے نام۔ وطن اور خیریت دریافت فرمائی۔ مولانا کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ تصویر کا خاکہ جو مدت سے ذہن میں تھا وہ قریب قریب صحیح تھا۔ چند باریک خد و خال رہ گئے تھے وہ آج اُبھر آئے۔

ہمارا بیچ اُردو میں ایم۔ اے کا پہلا بیچ تھا۔ آٹھ طلبا نے داخلہ لیا لیکن امتداد زمانہ سے صرف پانچ رہ گئے۔ ان میں ایک دہلی کے تھے۔ تین یو۔پی کے اور صُرف میں ایک راجپوتانہ کا۔ خوش نصیبی سے ساتھیوں میں ایک ایسے بزرگ بھی مل گئے جو فارسی میں ایم۔اے تھے اور علوم السنہ شرقیہ کے امتحانات ختم کر چکے تھے۔ کافی عمر تھی اور ویسے بھی بزرگ صورت تھے (نام مجھے یاد ہے لیکن رفع شر کے لئے نہ لکھنا مناسب) قابلیت اور صورت کے اعتبار سے ہمارے اور مولانا کے درمیان وہ ایک خوشگوار وسیلہ یا سلسلہ تھے اس لئے خلیفہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ساتھیوں میں سوائے میرے اور ایک اور صاحب کے سب ہی ایسے تھے جو اُردو کو 'خانہ زاد' یا 'خانہ ساز' سمجھتے تھے۔ ایک صاحب تھے جو اکبر الہ آبادی سے سلسلۂ نسب ملاتے تھے۔ دوسرے کسی اُردو اخبار میں زورِ قلم دکھا چکے تھے۔ تیسرے صاحب رامپور سے تازہ وارد تھے۔ اور وہاں مشاعروں کے مہتمم رہ چکے تھے۔ لیکن ہم دونوں ان امتیازات کے اعتبار سے کورے تھے۔ قانون علیحدہ گلے کا ہار تھا اس لئے مولانا کی توجہ کے ہم ویسے بھی مستحق نہیں تھے۔ غرض یہ تھے وہ اُردو ڈپارٹمنٹ کے عناصر خمسہ جنہیں سب سے پہلے ایم۔اے کی خراد پر چڑھنا تھا۔

مولانا کو نمائش، تصنع اور تکلف سے بہت نفرت تھی۔ نمائش خواہ کسی صورت میں کسی کی جانب سے ہوتی انہیں سخت ناگوار گذرتی۔ اوپر لکھ آیا ہوں کہ اُردو سے دیرینہ وابستگی یا تعلق کی ہمارے پاس کوئی سند نہیں تھی اس لئے کلاس میں یکسوئی سے سنتے اور توجہ کے ساتھ پڑھتے۔ درجہ کے خلیفہ جی نہایت مرنجان مرنج تھے۔ اُن سے اکثر علمی و ادبی معرکے ہوتے۔ مقابلتاً ہمارا

مبلغ علم نا مکمل اور تشنہ تھا۔ دوران بحث میں ہم انہیں سے کوئی علمی یا ادبی نکتہ لے اُڑتے اور
اُسے اپنا کر ایسی ترتیب وسلیقہ سے خلیفہ جی کے سامنے رکھتے کہ وہ زچ ہو جاتے اور تقصیر علم کا
اعتراف کر لیتے۔ اُن کی یہ بیکسی دیکھ کر مولنا کو ان سے خاص ہمدردی ہو گئی تھی لیکن اس کے
باوجود جب بھی خلیفہ جی 'مغلق' زبان بولتے یا کسی اور طرح اپنی علیت کا غیر ضروری اظہار کرتے
تو مولنا بہت ناخوش ہوتے۔ کلاس میں کسی کی جانب سے بھی اگر کوئی ایسی بات ہوتی جس میں
نمایش یا تصنع کا رنگ ہوتا تو انہیں رنج ہوتا تھا۔ نامناسب کسرِ نفسی کو بھی برا سمجھتے تھے اور
اپنا اصول واضح کرتے۔ مولنا کا یہ طریقہ محض شاگردوں اور ہمعصروں کے ساتھ ہی نہ تھا بلکہ بڑی
سے بڑی شخصیت میں بھی وہ غیر ضروری نمود کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک روز ڈپارٹمنٹ
میں ہی مولنا کلاس لے رہے تھے کہ ایک مشہور نیشنلسٹ بزرگ جو عرصہ تک لیڈروں کی صف
اوّل میں رہ چکے تھے تشریف لائے۔ دوران گفتگو میں ان کا انداز نہ ان کے شایانِ شان تھا
اور نہ اُن کے مخاطبین کے۔ مولنا اپنی طبیعت سے مجبور ہو گئے اور برملا اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

مولنا نے کسی یونیورسٹی یا مدرسے ڈگری یا سند حاصل نہیں کی تھی۔ مکتب میں ہی انہوں
نے فارسی عربی کی منتہی تعلیم حاصل کی تھی۔ فرماتے تھے کہ حصول تعلیم میں اب بہت سی قیدیں
لگی ہوئی ہیں۔ عمر کی قید۔ مدت تعلیم کی قید۔ مقررہ نصاب کی قید۔ آخر قابلیت کا معیار نہ گرے
تو کیا ہو۔ ویسے ہی علم کا شوق لوگوں میں نہیں ان پابندیوں نے رہا سہا اور بھی ختم کر دیا۔
استاد شاگرد کے تعلقات کا بھی اکثر ذکر ہوتا۔ اپنے اُستادوں کا نہایت ادب واحترام
سے ذکر کرتے خود بھی اپنے شاگردوں سے ہمیشہ عزت اور محبت سے پیش آتے اور اُن کی
ممکن اعانت میں کبھی دریغ نہ کرتے۔ فرماتے کہ شاگرد اُستاد کا فرزند معنوی ہوتا ہے لیکن
اب زمانہ نے سب چیزوں کو بدل دیا اور یہ شعر پڑھتے ؎

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

ـــہ بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے (اقبال)

مولنا کی خفگی یا ناخوشی تھوڑی دیر کی ہوتی اور اس خفگی میں بھی شفقت کا پہلو ہوتا۔ مزاج شناس ہونے کی وجہ سے ہم اُنہیں جلد خوش کر لیتے۔ حفظ مراتب آداب و تہذیب کا اُنھیں بہت خیال رہتا تھا لیکن بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی بھی دل کھولکر داد دیتے تھے کہ انکے گرد و پیش رہنے والے طلبا آداب محفل سے بخوبی آگاہ ہو جائیں اس لئے اکثر لکھنؤ اور دہلی کی قدیم محفلوں کے تذکرے سناتے اور نشست و برخاست کے طریقے اور گفتگو کے آداب بتاتے ایک روز کا واقعہ ہے کہ مولنا ڈپارٹمنٹ سے کلاس میں جانے کے لئے اُٹھے ہم لوگ اُن کے جلو میں تھے۔ ایم اے کلاس اس زمانہ میں سیمینار سے متصل چھوٹے کمرہ میں ہوتا تھا۔ بارش کا زمانہ تھا سیمینار ہال کے اونچے اونچے کواڑ سخت ہو گئے تھے۔ مولنا نے دروازہ کھولا تو کواڑ نہ کھلے میں نے آگے بڑھ کر کواڑ کھولے تو اس وقت نہایت پاس سے کہا۔ پیری و صد عیب'۔ لیکن میں نے اسی وقت عرض کیا کہ کواڑ تو دراصل آپنے ہی کھولدئے تھے یہ تو صرف ہمت افزائی کے لئے مجھے موقع عنایت ہوا ورنہ خود اعتمادی ہم لوگوں میں کیسے پیدا ہو۔ مولنا یہ جواب سُنکر مسرور ہوئے اور دعا دی۔

مولنا کی زندگی کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا شعر و ادب کی خدمت ایفا ہی ایک مشغلہ تھا بلکہ یہ ایک قسم کا روگ تھا۔ جو اُنھیں لگ گیا تھا۔ ہر وقت اسی میں منہمک رہتے تھے۔ اُردو لٹریچر میں کوئی کتاب کہیں شائع ہوتی تا وقتیکہ اُسے دیکھ نہیں لیتے چین نہیں آتا تھا۔ اردو ادب کے قدیم و جدید اسلوب پر بڑی غایر نظر رکھتے تھے اور تحریروں میں بے راہ روی پر ہمیں ٹوکتے اور اصلاح کر دیتے۔ آج کل خدمتِ ادب کے نام سے اپنی شخصیت کو زیادہ اُبھارنا اور دوسروں کو مرعوب کرنا مقصود ہوتا ہے تاکہ شہرت میں اضافہ ہو اور دیگر صفات میں ایک صفت اضافی اور شامل ہو جائے۔ یہ سودا بہت سستا رہتا ہے لیکن مولنا

کے ساتھ ادبی خدمت زندگی کا لازمہ بن چکی تھی اور یہی ان کی زندگی کا اوّل و آخر نصب العین تھا۔
زبان سے متعلق کیسا ہی جدید ترین مسئلہ لسانی۔ تاریخی یا رسم الخط قسم کا ہوتا اور
یہ خیال ہوتا کہ ابھی انہوں نے کوئی رائے قائم نہ کی ہوگی مگر مولنا فوراً ہی سلسلہ کلام اس
طرح شروع کر دیتے گویا مدت ہوئی موصوف مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کر چکے ہیں۔ مسئلہ کے متعلق
مستند معلومات۔ جزئیات پر گہرا عبور۔ بیشمار تاریخی حوالے مسئلہ کی ارتقائی کیفیت۔ حال اور
مستقبل غرض کوئی پہلو ایسا نہ ہوتا کہ وہ اُسے واضح نہ کرتے۔ تین تین چار پہر گذر جاتے نہ ہمیں
وقت گذرتا معلوم ہوتا اور نہ مولنا کو تسکین ہوتی۔ یہ معلوم ہوتا کہ ایک عدیم المثال غواص
اور پیراک ہے جو ہمیں سمندر کی تہہ میں پہنچا کر ہم سے موتی نکلوا رہا ہے۔

اُردو ادب و تنقید میں مولنا نے کافی لٹریچر فراہم کیا۔ رسالہ سہیل جو غالباً جنوری ۲۶ء
میں علی گڑھ کے افق پر طلوع ہوا ادب کا پہلا اور آخری معیاری رسالہ تھا اس کی تقلید بہت
سے رسائل نے کی لیکن کوئی حریف نہ بن سکا۔ تبصرہ و تنقید کی خدمت مولنا کے سپرد تھی اس
خدمت کو ایسی کاوش اور تحقیق سے انجام دیا کہ اُردو لٹریچر کے لئے وہ تنقید کسوٹی کا کام دیتی
تھی۔ مولنا نے کلیات ولی کو بھی ترتیب دے کر ایک بڑی کمی کو پورا کیا۔ جس محنت اور قابلیت
سے اُسے مرتب کیا اس کا صحیح اندازہ کلیات دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ قریب اٹھارہ قدیم اور
نایاب نسخوں سے اس کا مقابلہ اور صحت کی تھی۔ کلیات کے شروع میں ایک لبسیط اور پُر از معلومات
مقدمہ لکھا اور ایک ضمیمہ اختلاف نسخ پر ترتیب دیا۔ دراصل مولنا کی اس محنت و عرقریزی نے
اُردو شاعری کی بنیاد کو استوار کر دیا۔ حق یہ ہے کہ یہ اُن کا ہی کام تھا شعر و سخن سے مولنا
کو فطری لگاؤ تھا ان کی طبیعت میں آمد بھی تھی اور آورد بھی یہ بتانا مشکل ہے کہ کونسی چیز زیادہ
تھی۔ وہ ہر وقت شعر کہہ سکتے تھے اس لئے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی طبیعت میں آورد زیادہ ہے
مگر واقعہ یہ ہے کہ مولنا ہر وقت شعر و سخن کی فکر میں رہتے تھے ان کی فکر ہمارے اکثر پریشان
مو پریشان حال شاعروں کی طرح نہ تھی وہ نہایت سنجیدگی سے اپنے فرائض متعلقہ میں مصروف

رہتے علمی ادبی مسایل پر گفتگو کرتے رہتے مگر فکر شعر سے کبھی خالی نہیں رہتے تھے آورد کا مولانا کے کلام میں یوں بھی گمان ہوتا ہے کہ تقطیع۔ وزن اور قافیہ کے اعتبار سے ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہوتا تھا۔ نہایت سنگلاخ اور شوز زمین میں بھی ایسے پُر تاثیر شعر کہتے جو از دل خیزد و بر دل ریزد کے مصداق ہوتے۔

مولانا فن عروض کے مجتہد اور امام تھے اور اس اعتبار سے وہ اپنے ہمعصروں میں فرد تھے۔ علوم عربیہ کا بہت وسیع مطالعہ تھا۔ فارسی کے شعر و آداب سے خاص شغف تھا یہ جوہر داغ کی ہمنشینی میں ہم آہنگ ہو کر چمک اٹھے تھے۔ داغ سے مولانا کو والہانہ عقیدت تھی۔ ہمیشہ استاد کہتے جس ادب وعقیدت سے استاد کا ذکر کرتے آج تک دل پر اثر باقی ہے۔ ادب لطیف سے سخت بیزار تھے۔ کہتے کہ آخر یہ کیا نیچرل شاعری ہے کہ ایک تتلی اپنی سہیلیوں کے ساتھ دھانی قبا پہنے چمپا کی شاخ سے اُڑ کر گلاب کے پھول پر بیٹھ گئی اور گلاب سے اُڑ کر نسیم سحری میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ یا بندر اچھل کر لنگور کی گردن پر سوار ہو گیا اور لنگور نے زقند بھری تو کسی چھت پر۔ یہ تو بناتا تی شاعری ہوئی۔ فرماتے تھے کہ یہ خیال غلط ہے کہ اصلی اور واقعی شاعری داغ اور امیر تک موجود نہ تھی بلکہ اصلی اور واقعی شاعری اس وقت بھی تھی۔ اس زمانہ میں اسی تخیل کو پسند نہیں کیا جاتا یہ اپنی اپنی پسند ہے شاعری و شاعر پر کیا الزام۔

جب کئی ہفتے وزنی اور ٹھوس چیزیں سنتے اور لکھتے گذر جاتے تو آخر طبیعت اُکتا جاتی۔ کچھ چینج (change) کی سوجھتی۔ میں عثمانیہ کی بالائی منزل کے کمرہ میں رہتا تھا اس کے محاذ میں اُردو ڈپارٹمنٹ تھا۔ میاں شبیر سے جو اُردو ڈپارٹمنٹ کے چوکیدار یا "نگران خصوصی" تھے سمجھوتہ تھا چنانچہ وہ مولانا کے تشریف لانے کے کچھ منٹ بعد سگنل دیدیتے اور کچھ دیر کے بعد میں بھی کلاس میں پہنچ جاتا۔ مولانا دیکھتے ہی فرماتے کہاں تھے؟ کچھ بسورتی صورت بنا کر جواب دیا جاتا کہ طبیعت کچھ ایسی ہی ہو رہی ہے۔ دوسرے ساتھی کہتے مجھے بھی دو تین روز سے حرارت ہے۔ کچھ ملیریا کے آثار معلوم ہوتے ہیں پڑھنا ہم نہیں چاہتے لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ پڑھنے کے شوق میں

ہم نے بیماری پر بھی غلبہ پا لیا ہے ۔ لیکن مولنا خود ہی فرما دیتے بھئی اب تم لوگ آرام کرو۔ اس وقت صحت کے رکھ رکھاؤ کے طریقے سمجھاتے اور کہتے کہ آج کل کے انگریزی تعلیمیافتہ صحت کی مطلق توجہ نہیں کرتے ۔ نوے فیصدی کی صحت خراب ہوتی ہے جسے دیکھو کمر جھکی ہوئی اور چہرہ پر زردی ایک روز فرمانے لگے کیوں جی تم لوگ "قیلولہ" سے بھی واقف ہو پھر خود ہی قیلولہ کے آداب خواص اور فضائل بیان کئے جن سے کہ ہم ناواقف تھے ۔ میرے ایک ساتھی باہر نکل کر کہنے لگے بھئی خیریت ہوگئی ورنہ میں تو اس "قیلولہ" کو ایام جاہلیت کا قصیدہ گو شاعر سمجھا تھا۔ کبھی استاد کے کلام سے سلسلہ شروع ہوتا ۔ مولنا فلاں صاحب جو ٹریننگ کالج میں لیکچرر ہیں وہ استاد کے کلام پر اکثر اعتراض کرتے ہیں ۔ مولنا تڑپ اُٹھتے ۔ بھئی اعتراض کا کیا ذکر ہے ۔ کسی پر اعتراض کرنے سے وہ آدمی قابل اعتراض تھوڑا ہی ہو جاتا ہے اور کیوں جی تم تو قانون پڑھتے ہو ۔ اعتراض تو لوگ خدا پر بھی کر دیتے ہیں (نعوذ باللہ) میں اُن صاحب سے خوب واقف ہوں جو اُن کے اعتراض ہیں وہ شعر کے سب سے بڑے محاسن ہیں ۔ پھر سینکڑوں مثالیں تائید میں بتاتے ۔ شعرائے قدیم کے لاتعداد اشعار بطور اسناد سناتے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شعر و سخن کا ایک بے پناہ سیلاب اُمنڈ آیا ہے جو ہر چیز کو بہالیجائے گا ۔

اکثر نوٹس لکھاتے اور یہ سلسلہ متواتر کئی روز تک جاری رہتا مسلسل نوٹس لکھنا صبر آزما ہوتا ہے اس سے مخلصی کی فکر ہوتی ۔ ایک مرتبہ غالب پر نوٹس لکھا رہے تھے اور کئی روز ہوچکے تھے تمثیل میں اکثر اشعار لکھاتے ۔ اسی سلسلہ میں کہیں مولنا نے غالب کی چھوٹی بحر کا ایک شعر لکھایا ۔ خلیفہ جی نے جو پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے شعر تو لکھدیا تھا لیکن اوپر سے کچھ لکھنا رہ گیا تھا مجھسے دریافت کرنے لگے ۔ مولنا نے کہا کیا ہے ؟ میں نے کہا کہتے ہیں کہ مولنا نے یہ پہلا مصرع تو لکھا دیا ؎ ہاں کہائیو مت فریب ہستی ۔ ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے ۔ مصرع ثانی نہیں لکھایا ۔ خلیفہ جی نے میری طرف آنکھیں نکالیں لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا ۔ مولنا اب کہاں موقع دیتے تھے ۔ جس طرح مولنا نے خلیفہ جی کی پذیرائی کی وہ تو خلیفہ جی ہی بتا سکتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے

کہ مدتوں وہ مجھسے بیزار رہے مولانا کو محترمی حاذق صاحب سے خاص نسبت تھی۔ کبھی حاذق صاحب تشریف لے آتے۔ رشید صاحب صدر شعبہ صدر نشین ہوتے اس وقت جو ادب آفرینیاں ہوتیں اگرچہ مدت گذر گئی لیکن وہ جواہر ریزے اب بھی دل و دماغ کی بہترین متاع ہیں۔ یہی وہ فیضان ہے جس سے علی گڑھ والے کسی دوسرے کے محتاج نہیں رہتے۔ انہیں اپنے رفیقان کار سے انس تھا اور بہت عزیز رکھتے تھے۔ ریٹائرڈ ہونے پر رخصتی مینر کے عنوان سے جو نظم اُنہوں نے پڑھی وہ اُن کے جذبات کا صحیح مرقع ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اُردو کا ڈپارٹمنٹ یکسر　　میری خدمات کا تھا محور
صدر اسکے ہیں نیک و پاک سیرت　　صدیقی و حاذق المودت
اور اسکے سوا جو لیکچرر ہیں　　ایک ایس سرور خوش سیر ہیں
حاذق کا فراق ہی شاق　　کہتا ہے یہ انسے انکا مشتاق
حاذق رخصت ظہیر رخصت
آخر میں میاں منیر رخصت

مشاعروں سے بھی مولانا کو بہت دلچسپی تھی لیکن موجودہ طرز کے مشاعروں کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کے خیال میں مشاعروں میں ہنگامے تو زیادہ قابل اعتراض نہیں تھے اس لئے کہ ہر شخص ہی سخن فہم ہونے کا مدعی ہوتا ہے اگر کوئی اچھا شعر سنکر وجد کرنے لگے یا نقص امن کا اندیشہ ہو تب بھی مضائقہ نہیں مگر آج کل کے مشاعرے تو صرف موسیقی کے مقابلے کے لئے ہوتے ہیں یہ ننگے سر مشاعروں میں ترنم ریزی کرنا کونسی تہذیب ہے اور کیسے آداب مشاعرہ ہیں انہیں اس سے بھی کوفت ہوتی تھی کہ ہر شخص اقبال کے رنگ میں شعر کہتا ہے اور معلوم نہیں لوگ کیوں ایک ناممکن بات پر وقت ضائع کرتے ہیں اپنے ہی رنگ میں شعر کہیں تو بہتر ہے اقبال کے آگے اب کسی کا چراغ نہیں جل سکتا۔ استاد نے زبان کو سدھارا آراستہ کیا لیکن اقبال نے زبان کو ایسا استوار اور سیراب کیا کہ وہ انمٹ ہو چکی۔ اقبال نے استاد اور زبان

دونوں کو حیات جاویدبخشی اور یہ اقبال کا ملک پر بہت بڑا احسان ہے۔

مولنا بہت خوش پوشاک تھے۔ یونیفارم بن ہمیشہ کلاس میں تشریف لانے سہ پہر کو مکان پر دوپلی ٹوپی۔ ململ کا کرتہ۔ غرارہ دار پائجامہ استعمال کرتے یہ وقت خطوط نویسی کا تھا اور دس بارہ خطوط کے جواب لکھتے۔ ملاقات کا بھی یہی وقت تھا۔ چاء کے خود بھی شایق تھے اور چار فواکھات سے تواضع کرتے۔ میں کبھی سہ پہر کو حاضر ہوتا تو بہت خوش ہوتے۔ زیادہ خوش ہوتے تو کہتے کہ ایم۔اے کے ساتھ یہ قانون کا جھگڑا کیوں لگالیا۔ یکسوئی سے ایم اے کرکے ادب کی کچھ خدمت کرتے۔ میں عرض کرتا کہ ادیب جب تک جوان رہتا ہے بہت بر خود غلط ہوتا ہے۔ اس کا شباب بیکاری اور مشاعروں میں گذرتا ہے اس لئے ہر نوجوان ادیب کو مزدور کی شام۔ سرمایہ دار کا انجام۔ بیوہ کا شباب۔ ساڑھی کا آنچل قسم کی چیز پر طبع آزمائی سے پہلے قانون کی حدود سے واقف ہونا قرین مصلحت ہے۔ مولنا سنتے جاتے اور لطف اُٹھاتے۔

مولنا اوقات کے بہت پابند تھے لیکن یہ پابندی خود اختیاری نہ تھی ان کے ملازم خاص علیم اللہ کی پابند اوقات تھی جس نے انھیں پابند کر رکھا تھا۔ اگر مولنا کا مشغلہ شعر و ادب کی خدمت تھا تو علیم اللہ کی زندگی کا مقصد مولنا کی خدمت تھا۔ جس صحت وقت کے ساتھ علیم اللہ مولنا کی ضروریات کا خیال رکھتا اُسے دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ دوا۔ کھانا۔ چاء۔ کٹا ہوا پان۔ وضو۔ مسودات ڈاک۔ قلم دوات۔ چشمہ۔ معجون وغیرہ غرض اس کے ذمہ مختلف فرائض تھے لیکن وہ اس طرح انجام دیتا تھا کہ مولنا کو مطلق ہاتھ ہلانے اور منھ کھولنے کی ضرورت نہ تھی۔ علیم اللہ کی نظر گھڑی کی سوئی پر ہوتی اور ہاتھ میکانکی طور پر خدمت میں مصروف۔

مولنا سے آخری مرتبہ لکھنؤ میں نیاز حاصل ہوا۔ ۳۶ء کی مشہور آل انڈیا نمائش لکھنؤ میں ہوئی تھی اس کے ساتھ ایک مشاعرہ کا بھی اہتمام تھا۔ مشاعرہ کے بعد ملاقات ہوئی مولنا مجھے دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور بڑی بیتابی سے معانقہ کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی باتیں کرنا چاہتے ہیں لیکن ازدیاد مسرت سے بات نہیں کر سکتے۔ ساتھیوں کا حال دریافت کیا۔ فرمایا کہ الہ آباد

ضرور آؤں گا۔ مولنا نے اپنا وعدہ پورا کیا لیکن میں اس سے قبل الہ آباد سے آچکا تھا۔
مگر میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہا ہوں کیا مولنا کی یاد میں۔ کیا مولنا کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہوں اس لئے کہ اُن سے فیضیاب ہوا۔ نہیں اس سے بھی کچھ زیادہ بہت زیادہ علیگڑھ کی یاد میں بڑی کشش ہے۔ شاگرد ہو استاد ہو یہ سب کے دلوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔ جو علی گڑھ میں رہتے ہیں انھیں کیا معلوم کہ اس کے دور افتادہ بیشمار دیوانوں کی نظر میں علی گڑھ کس قدر محبوب و وقیع ہے اور جس کی یاد کو وہ حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ مولنا علی گڑھ کے فدائیوں میں تھے اور علی گڑھ کو وہ محبوب۔ ان کا وجود یونیورسٹی میں ایک مستقل ادارہ تھا ان کے اُٹھ جانے سے یونیورسٹی میں ایک ایسا خلا ہو گیا جو افسوس ہے کہ جلد پُر نہ ہو سکے گا۔

احسن الاصلاح

مرتبہ جناب راز احسنی صاحب سہسوانی

حضرت قبلہ مولانا احسن مارہروی رحمۃ اللہ علیہ کی نادر اصلاحیں

شعر و سخن کی اصلاح کے متعلق جو مضمون پیش کیا جائے اس کے اجزائے ترکیبی شعر و شاعری اور شاعر کی تعریف، ضروریات اصلاح، استاد کامل کا مرتبہ۔ مصلح سخن کی شان وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ میں اگر ان پر بحث کروں تو میری بے بضاعتی و بے مائیگی علم و معلومات کے باوجود مضمون یقیناً طویل اور زیادہ طویل ہو جائے گا۔ اور یہاں طوالت مد نظر نہیں ہے لہٰذا ان سب باتوں سے درگذر ہی اولیٰ تر ہے۔ اگر ضمناً اس قسم کا کچھ تذکرہ مختصراً اور اجمالی طور پر آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

شاعری کی تعریف خواہ کچھ ہو مگر یہ مسلّہ ہے کہ یہ ہے فطری چیز اور عطیہ خداوندی! قریب قریب ہر زمانے میں اور ہر زبان کے شاعروں میں ایسے شعرا خال خال پائے جاتے ہیں جنہوں نے باوجود صاحب علم نہ ہونے کے دنیائے سخن میں مقبولیت حاصل کی۔ میرے وطن سہسوان ہی میں جو علم و فضل کا مرکز رہا ہے جناب قیوم بخش صاحب مضطر اچھے غزل گو اور بے مثل ہجو گو تھے لیکن پڑھے ہوئے بالکل نہ تھے ہر زبان کے شعرا میں ایسے شاعر بکثرت ملتے ہیں جنہوں نے کسی استاد فن کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کئے بغیر شہرت جاوید حاصل کی ہے دور کیوں جائیے اُردو کے شعرائے حال میں قبلہ فانی بدایونی ایسے شعرا کی زندہ مثال ہیں، لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ شاعری کے لئے علم کی ضرورت نہیں یا اس فن کی تکمیل کے لئے شاگرد ہونا غیر ضروری ہے حقیقت یہ ہے کہ شعر کو آخر العلوم کہا جاتا ہے اس لئے شاعر کا بے علم یا کم علم ہونا اچھا نہیں، شاعر کو زیادہ سے زیادہ علم کی ضرورت ہے، اور جہاں دنیا کا ہر کام اصلاح طلب ہے شاعری بھی اس سے بے نیاز نہیں۔ جائے استاد خالیست کا مقولہ اپنی جگہ اٹل ہے، دنیا کے روبرو سرفراز ہونے کے لئے کسی

ایک کے سامنے سر جھکا دینا ضروری ہے، استاد کی نظر اصلاح سے خواہ شاگرد فطری شاعر ہی کیوں نہ ہو فیض کا ہونا لازمی ہے۔ اصلاح سے اغلاط و اسقام کا دور ہونا اور کلام میں ترقی کا پیدا ہونا ضروری ہے البتہ استاد فن کا میسر آنا بھی آسان نہیں۔ یوں تو استاد کامل الفن میں اس درجہ خوبیوں کا ہونا ضروری ہے کہ اُن کا فرد واحد میں یکجا ہونا امر محال ہے، تاہم ایسی مقدس ہستیوں سے زمانہ خالی نہیں ہے، اس میں شبہ نہیں کہ ایسی برگزیدہ ہستیاں الشاذ کالمعدوم کی مصداق ہمارے زمانے میں بہت کم ہیں، لیکن ہیں ضرور، اور وہ رفتہ رفتہ اپنی جگہ خالی کرتی جا رہی ہیں، ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں استادان فن سے ہندوستان خالی ہو جائے۔

اکثر شعرا اپنے کسی مخصوص انداز کی وجہ سے یا کسی بڑی ہستی کی سرپرستی کے سبب سے شرف قبول حاصل کر لیتے ہیں اور عوام الناس میں قدر و منزلت پا جاتے ہیں ایسے شعراء کی شاگردی سے کوئی فیض نہیں ہوتا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے یعنی شاگرد ہونے کے لئے زیادہ چھان بین کی ضرورت ہے، مگر میں نے اس چھان بین کو اپنے خیال میں زیادہ محدود کر لیا ہے یعنی صرف یہ کہ استاد فن صرف اس ہستی کو سمجھنا چاہئے جسے نقاد شعرا کا طبقہ استاد کامل تسلیم کرتا ہو۔ اور عوام الناس کی آواز پر نہ جانا چاہئے۔

اساتذہ اصلاح میں خصوصیات زبان، محاسن و معائب سخن، مناسب الفاظ کے استعمال ترقی شعری، رنگ زمانہ وغیرہ وغیرہ خصوصیات کا لحاظ رکھتے ہیں، حتی الامکان مضمون شعر نہیں بدلتے، کہیں کہیں مضمون بدل بھی جاتا ہے اور اس سے شعر میں ترقی پیدا ہو جاتی ہے، شاگردوں کو اُن کی غلطیوں اور لغزشوں سے مطلع فرماتے ہیں جس سے شاگردوں کو آئندہ محتاط رہنا چاہئے، اگر شاگرد اصلاحوں پر نظر رکھتا ہے تو بے نیاز اصلاح ہو جاتا ہے۔

اصلاح بر کلام مخدوم زادہ حضرت مولانا حافظ سید سعید احسن صاحب سعید مدظلہ

سعید مہرباں جب سے ہمارا ستم ایجاد نہیں	زندگی کا بھی مزا اے دل ناشاد نہیں
اصلاح مہرباں الخ	مرنے جینے کا مزا الخ

ایک صرف زندگی کا مزا اور ایک مرنے جینے کا مزا بڑا فرق رکھتا ہے اصلاح سے شعر میں نمایاں ترقی پیدا ہوگئی اور شعر زیادہ معنی خیز ہو گیا۔

سعید لوگ کہتے ہیں کہ رہتی ہیں امیدیں دلیں ہم نے دیکھا تو یہ گھر نام کو آباد نہیں

اصلاح لوگ کہتے ہیں کہ بستی ہیں الخ ہم الخ

ذراسی اصلاح سے شعر میں لطافت زبان کا اضافہ ہو گیا، رہنے اور بسنے کا نازک فرق لائق ملاحظہ ہے۔

سعید قابل دید ہے یہ شان بھی اب انکی سعید میں تو ہوں یاد مگر بات مری یاد نہیں

اصلاح قابل دید ہے یہ شان تغافل بھی سعید میں الخ

سبحان اللہ ایک لفظ تغافل سے شعر کتنا بلیغ و پُر لطف ہو گیا۔

اصلاح بر کلام قاضی لطیف الدین احمد صاحب اشہر ایٹہ

اشہر اسیر ہو کے بھی باقی وہی فسانہ تھا بھرا نگاہ میں گلشن کا اک زمانہ تھا

اصلاح اسیر ہو کے یہ لب پر مرے فسانہ تھا کہاں چمن ہے جہاں میرا آشیانہ تھا

اصل شعر کے دونوں مصرعے غیر مربوط تھے اور مصرعہ ثانی میں تعقید کا عیب تھا، اصلاح سے شعر بہت رواں اور لطیف ہو گیا۔

اشہر تڑپ رہی تھی جو بلبل سبب یہ تھا اُسکا قفس کے قرب میں اجڑا سا آشیانہ تھا

اصلاح مری نظر میں بیک وقت تھی بہار و خزاں قفس بسا ہوا، برباد آشیانہ تھا

اصل شعر بہت پھُس پھُسا تھا۔ اصلاح سے شعر، شعر ہو گیا، بہار و خزاں کا بیک وقت نظر میں ہونا کیسے پیارے الفاظ ہیں، بسا ہوا کی معنویت قابل ملاحظہ ہے۔

اشہر شہید یاس کی مجبوریاں ہوئیں رہبر جہاں بھی بیٹھ گیا بس وہ آستانہ تھا

اصلاح نیاز مند ترا ہر جگہ نہیں جھکتا جہاں سر اس کا جھکا تیرا آستانہ تھا

یاس کے معنی ہیں ناامیدی کے لہذا شہید یاس کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی کہ وہ جہاں

بیٹھ جائے وہیں آستانہ محبوب ہو اور یہ حقیقت ہے کہ کسی محبوب کا نیاز مند جز در محبوب کہیں سر نہیں جھکا سکتا "

اشہر — نہ بیکسی میں بھی چھوڑا اصول خودداری | غبارِ راہ گذر اپنا آشیانہ تھا
اصلاح — نمود شانِ امارت تھی شام غربت میں | غبار الخ

شعر سے پابندیٔ خودداری ثابت نہ تھی۔ نہ اظہار خودداری کی ضرورت تھی، بیکسی غربت میں بھی ہوسکتی ہے اور گھر بیٹھے، بیکسی کے کامل اظہار کے لئے شام غربت کا کیا کہنا اور پھر شام غربت میں نمود شان امارت کے لئے غبار راہ گزر کا آشیانہ ہونا بالکل درست اور نہایت موزوں ہے۔

اشہر — کہیں تھے پر کہیں بلبل کہیں نشیمن تھا | یہ انقلاب محبت کا اک فسانہ تھا
اصلاح — کہیں تھے تنکے کہیں بال و پر تھے بلبل کے | اک آشیانۂ ویراں کا یہ فسانہ تھا

تنکے اور پر دل اور نشیمن کے منتشر ہونے سے انقلاب محبت کا کوئی واسطہ نہیں تنکوں کے انتشار سے نشیمن کا وجود ہی نہیں رہ سکتا لہٰذا کہیں نشیمن تھا کہکر نشیمن کا وجود تسلیم کرنا بھی ٹھیک نہ تھا اور شعر میں اجتماع ردیفیں کا عیب بھی تھا، تنکے اور پروں کے انتشار کو آشیانہ ویران ہی کا فسانہ کہہ سکتے ہیں، نہ انقلاب محبت کا۔

اشہر — بلبل کی اب خبر لے کہہ دو یہ باغباں سے | کچھ برق کہہ رہی ہے جھک جھک کے آشیاں سے
اصلاح — بے تاب بلبلوں نے پوچھا یہ باغباں سے | کیا برق الخ

برق کا آشیاں سے جھک جھک کر کچھ کہنا، بلبلوں کو بے تاب کرنے کے لئے کافی تھا لہٰذا پہلے مصرعے میں اس طرف توجہ فرمائی گئی اور مصرعہ ثانی میں پوچھنے کی نسبت سے کچھ کی جگہ کیا بنایا گیا۔ استفہام کی صورت میں کیا ہی ہونا چاہئے تھا۔

اشہر — اے کاش وہ سمجھ لیں کچھ نالہ وفغاں سے | جو راز اُن سے کہہ دے لاؤں وہ دل کہاں سے
اصلاح — مطلب نہیں سمجھتے وہ نالہ وفغاں سے | جو الخ

اس اصلاح سے شعر میں روانی و سلاست پیدا ہوگئی، مطلب نہیں سمجھتے وہ نالہ و فغاں سے
کہنے میں زیادہ حسرت کا اظہار ہے۔ مصرعہ ثانی کے لئے انھیں الفاظ کی ضرورت تھی۔

اشہر ذوق نظر تو ہی کرکچھ میری ترجمانی — کیفیتیں سوا ہیں اندازۂ بیان سے
اصلاح ذوق نظر نے میرے کی میری ترجمانی — خاموشیوں کے معنی بڑھکر رہے بیان سے

مصرعہ اولیٰ میں تو، مخاطب کا داؤ دب گیا تھا بین الفصحا اس کا دینا غیر فصیح ہے۔ دوسرے مصرعے کی اصلاح سے شعر میں دل آویزی اور معنویت پیدا ہوگئی۔

اشہر ٹوٹے نہ دل کسی کا یہ بھی ثواب لیجئے — انکار ہے تو اچھا کہئے نہ کچھ زبان سے
اصلاح ٹوٹے نہ دل کسی کا اتنا لحاظ رکھئے — انکار الخ

بصورت انکار زبان سے کچھ نہ کہنے کی خواہش کے اظہار کے لئے، اتنا لحاظ رکھئے، نہایت پیارا ٹکڑا ہے

اصلاح بر کلام جناب سید تجمل حسین صاحب اختر بریلوی

اختر ہو کائنات کے اختر کی صرف تم مالک — جو جاں بھی مانگو تو ممکن نہیں بہانہ کرے
اصلاح نہ دل نہ مال نہ اختر کو تم سے جان عزیز — کسی طلب پہ وہ ممکن نہیں بہانہ کرے

پہلے مصرعے میں تعقید تھی، مصرعہ ثانی میں، جو جاں، برا تھا۔ اور جاں بغیر ترکیب اضافی کے نون غنہ کے ساتھ واقع ہوا تھا ایک کثر یہ بھی تھی کہ جو کسی چیز کا مالک ہو وہ مانگنے کیوں لگا اور اس سے بہانہ کیا، شعر میں جس قدر کوتاہیاں تھیں۔ اصلاح سے سب جاتی رہیں، اور دل جان۔ مال کی وضاحت سے شعر بہت بلند ہوگیا۔

اختر مرے پاس اور کیا تھا جو ترے دربار میں لاتا — یہ کیا کم ہے تمنا ہی تمنا لے کے آیا ہوں
اصلاح مرے الخ — مجبوری تمنا الخ

یہ کیا کم ہے کی جگہ، مجبوری، بنایا گیا، مصرعہ اولیٰ میں کہا گیا تھا کہ میرے پاس تیرے دربار میں لانے کے لئے اور کچھ نہ تھا، گویا یقیناً اپنی مجبوری کا اظہار کیا گیا تھا، ایسی حالت میں کم و بیش کا

کچھ نہیں" پھر تمنا ہی تمنا کہنا بھی درست نہ تھا اس موقع پر صرف، تمنا کہا جا سکتا تھا، مجبوری نے تمنا ہی تمنا درست ہی نہیں کرایا بلکہ لطافت پیدا کر دی اور مصرعہ اولیٰ کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی سے ہوگئی۔ اور شعر بہت سلیس و لطیف ہوگیا۔

اختر یہ بات سچ ہی محبت میں اُن کی جیت ہوئی — مگر وہ یوں کہ جفا اُن سے قول ہاری ہی
اصلاح یہ الخ — مگر وہ یوں کہ وفا ہم سے الخ

معشوق خواہ کیسا ہی جفا جو ہو، جب تک عاشق وفاخو نہ ہو، جفاؤں کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا، یعنی اگر عاشق وفاؤں سے منہ پھیر لے تو پھر جفائیں کس پر ہو سکتی ہیں، جفا تو وفا کے مقابلہ ہی میں ہوتی ہے لہذا معشوق کی جیت اُس کی جفاؤں سے نہیں ہو سکتی، عاشق کی وفاؤں سے معشوق کی جیت لازمی ہے، اصلاح میں یہی نازک فرق ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

اختر جو چور کی سزا وہ ہماری سزا رہے — اچھا ذرا دکھاؤ تو چاہت نباہ کے ،
اصلاح آتا نہیں یقین کہ چاہو گے تم ہمیں — اچھا الخ

دونوں مصرعے باہم غیر مربوط تھے، اور جو مفہوم ادا کرنا چاہا تھا وہ ادا نہ ہو سکا تھا، غالباً یہ مطلب تھا کہ ہمارا دعویٰ ہے، تم چاہت نہیں نباہ سکو گے، اگر نباہ سکو تو جو چور کو سزا دیجاتی ہے وہ ہمیں دی جائے لیکن یہ مطلب شعر کے الفاظ سے ادا نہیں ہوا تھا، اصلاح میں آتا نہیں یقین کہ چاہو گے تم ہمیں" بنا دیا جو مصرعہ ثانی سے صرف ربط ہی نہیں رکھتا بلکہ شعر میں شگفتگی اور لطافت پیدا ہوگئی۔

اختر ایسا گیا کہ لوٹ کے لی ہی نہیں خبر — وہ دل کہ جس میں سارے زمانے کا درد تھا
اصلاح ایسا گیا کہ اس نے پلٹ کر نہ لی خبر — وہ الخ

نوٹ "لوٹنا گنواری بولی ہے"۔

اختر اُس کی آنکھوں میں نہ کیونکر ہو اندھیری دنیا — چشم اختر میں سما کر مہ تاباں نکلا

اصلاح اس کی آنکھوں میں نہ کیونکر ہو زمانہ روشن   چشم الخ

اصلاح سے شعر کی کایا ہی پلٹ گئی اور بہت خوب ہو گیا۔

اختر سزا اے دل تجھے مل کر رہیگی اس محبت کی   اگر بربادیوں کا خوف ہو تو پھر خطا کیوں ہو

اصلاح سزا اے دل تجھے مل کر رہیگی جرم الفت کی   جسے بربادیوں کا خوف ہو اس سے خطا کیوں ہو

سزا جرم ہی کی ہوتی ہے اس لئے جرم الفت بنایا گیا۔

اختر جو عشق پائدار ہے تو حسن لاجواب ہے   اگر تو انتخاب ہے تو دل بھی انتخاب ہے

اصلاح جو الخ   اگر تم انتخاب ہو تو الخ

تو مخاطب کا واؤ دبتا تھا، اس لئے اصلاح دی گئی۔

اختر جنونِ عشق جیتے جی نہ گھٹ سکے نہ جا سکے   ابھی تو تو جوان ہے ابھی مرا شباب ہے

اصلاح جنونِ عشق جائے کیا گھٹے تو کس طرح گھٹے   ابھی الخ

پہلے مصرعے میں جنونِ عشق کے نہ گھٹنے اور جانے کی شرط تھی عمر بھر کے لئے اور مصرعہ ثانی میں اپنی اور محبوب کی موجودہ حالت کا اظہار تھا۔ جنونِ عشق نہ گھٹنے اور نہ جانے کا سبب تھا طرفین کی جوانی، جو ہمیشہ رہنے کی چیز نہیں لہذا دونوں مصرعوں میں مطابقت نہ تھی۔ اصلاح سے جیتے کی شرط نکال دی، اب دونوں مصرعے مربوط ہو گئے اور شعر بہت صاف اور بہتر ہو گیا۔

اختر دیکھو تو مریض غم کو آ کر   پھر کہنا کہ درد کی دوا کر

اصلاح سنئے تو مریض غم کی آ کر   پھر کہئے کہ درد کی دوا کر

دیکھنے اور سننے میں یہ فرق ہے کہ دیکھنے سے ضروری نہیں تھا کہ مریض غم کی صحیح حالت معلوم ہو اور سننے سے حالت ٹھیک معلوم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جس پر گذر رہی ہے وہی بیان کرنے والا ہے، اور پھر درد دیکھنے کی چیز نہیں، درد کا حال سننے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لہذا دیکھو کی جگہ سنئے بنایا گیا اور اُسی کی مناسبت سے کہنا کی بجائے

کہئے رکھا گیا۔ وسیع النظر مصلحانِ سخن کی نگاہ نکتہ بیں سے ذرا ذرا سی بات بھی نہیں بچ سکتی۔

اختر کہ جوان ہوکر کریں وہ ملک پر جانیں نثار

اصلاح نوجوان الخ

نوٹ۔ اچھے خاصے کہنے والے سے ایسی غلطی کا ہونا تعجب خیز ہے، اب کاف بیانیہ کھینچ کر نظم نہیں کیا جاتا آئندہ خیال رہے۔

اختر تم کو ہمارے حال کی پرواذرا نہیں یہ دیدہ میرے غم میں کبھی نم نہیں رہا

اصلاح دل بھی شبِ فراق رہا مضطرو حزیں اور اُس کے ساتھ دیدۂ گریاں بھی نم رہا

نوٹ۔ تنہا دیدہ لکھنا اُردو میں فصیح نہیں۔

مصرعہ اولیٰ میں ہمارے جمع متکلم تھا، اور دوسرے میں واحد متکلم، یہ درست نہیں۔ اس عیب کا نام شتر گربہ ہے۔ اصلاح سے یہ عیب بھی نکل گیا اور دیدہ بھی۔ ترکیب اضافی نظم ہوکر غیر فصیح سے فصیح ہو گیا اور شعر صاف وسلیس ہو گیا۔

اختر اگرچہ ہے تو میری چاہت کا منکر مگر اس پہ بھی دل کی چاہت وہی ہے

اصلاح مری چاہ کا تو ہے ہر چند منکر مگر الخ

نوٹ۔ اگرچہ میں چہ کا اشباع غیر فصیح ہے۔

اختر تیوری پہ وہ بل ڈال کے بولے مجھ سے۔

نوٹ۔ دلّی والے تیوری بروزن رہبری بولتے ہیں جیسے "سنتا ہوں تیوری ہے کسی کی چڑھی ہوئی مگر میں اب اس کو بھی جائز سمجھتا ہوں لہٰذا رہنے دیا۔

اختر تری پھری ہوئی نظروں سے بچنا دل کا مشکل تھا "

نوٹ۔ نظر کا پھرنا نامسموع ہے "

اختر دکھے دل پر دکھن کا تیر مارا

اصلاح دکھے دل پر غضب کا تیر مارا

نوٹ، یہ دکھن کا تیر کیا بلا ہے:

اختر خلط ملط اُن سے بڑھانے تو چلا ہے اے دل خیر سے اپنا بھی کچھ نفع و ضرر دیکھ لیا

اصلاح ربط ضبط اُن الخ خیر الخ

نوٹ۔ خلط ملط ہونا بولتے ہیں کہ بڑھانا:

اصلاح میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس انداز کے الفاظ نکالے تھے ویسے ہی رکھدئے۔

اختر تیری فرقت رنج دیتی ہے ترے عشاق کو اور اس کو جو پجاری ہو تری تصویر کا

اصلاح تیری الخ بالخصوص اُس کو جو عاشق ہو تری تصویر کا

مصرعہ اولیٰ میں عشاق کو رنج دینے کا ذکر تھا، مصرعہ ثانی میں کہا گیا تھا اور اس کو جو پجاری ہو تری تصویر کا، اس طرح شعر کا مطلب یوں ہو گیا تھا کہ، تیری فرقت تیرے عشاق کو اور تیری تصویر کے پجاری کو رنج دیتی ہے، گویا عاشق اور تصویر کے پجاری میں تفریق کر دی گئی تھی، اور یہ تفریق ٹھیک نہ تھی کیونکہ عاشق ہی تصویر کا پجاری ہو سکتا ہے نہ کوئی اور، اصلاح میں بالخصوص اس کو جو عاشق ہو تری تصویر کا بنایا گیا اب مطلب یہ ہوا کہ تیری فرقت بالعموم تیرے سب عاشقوں کو اور بالخصوص تیری تصویر کے عاشق کو رنج دیتی ہے، اس تخصیص سے شعر میں خاص لطافت پیدا ہو گئی۔

اختر میں کبھی یہ نہ کہوں گا کہ کرم کیجئے آپ آپ خود دیکھئے الفت کا تقاضا کیا ہے

اصلاح میں الخ آپ خود سوچئے الفت الخ

اختر نیند آنکھوں میں ہے تاروں پہ نگاہیں مجھکو سونے نہیں دیتی ہیں یہ آہیں میری

اصلاح نیند الخ ہائے سونے نہیں دیتیں مجھے آہیں تیری

مصرعہ ثانی میں یہ حشو تھا اور ہائے کے لفظ سے تاسف میں بلا کا اضافہ ہو گیا۔

قطعہ

اختر میں نے ان آنکھوں سے دیکھا تیرا اثر مردہ جمال جسم لاغر، رنگ فق، غمگین نظر چہرہ نڈھال

نوٹ۔ نظر کی صفت غمگین غلط۔

چاند پھر بھی چاند ہی جاہے گھٹے چاہے بڑھے　　فرق اتنا ہے بڑھے تو بدر گھٹ جائے ہلال

اصلاح　میں الخ　　جسم لاغر رنگ فق پیچی نظر الخ

چاند الخ　　فرق اتنا ہے کہ بڑھ کر بدر ہے گھٹ کر ہلال

قطعہ کے دوسرے مصرعہ کا سبب تو حضرت قبلہؒ کے نوٹ سے واضح ہے چوتھا مصرعہ صاف نہ تھا اصلاح سے روانی پیدا ہو گئی اور قطعہ نہایت کامیاب قطعہ ہو گیا۔

اختر　اپنی بربادیوں کا غم مجھ کو　　سچ تو یہ ہے کبھی ذرا نہ ہوا

اصلاح　اپنی الخ　　مٹتے مٹتے کبھی ذرا نہ ہوا

سچ تو یہ ہے اور مٹتے مٹتے میں بڑا فرق ہے، سچ تو یہ ہے معمولی سی بات تھی اور مٹتے مٹتے زیادہ اہم ہے۔ شعر میں کافی ترقی و معنویت پیدا ہو گئی۔

اختر　حالانکہ محبت میں کوئی لطف نہیں ہے　　پھر بھی یہ مزیدار ہے معلوم نہیں کیوں

نوٹ۔ مزیدار، مستند شعرا کے ہاں غیر مستند ہے مگر اردو بول چال میں ہے اس لئے میں جائز سمجھتا ہوں۔

حضرت قبلہؒ کے بعض نوٹ جو اختر صاحب کو وقتاً فوقتاً بسلسلہ اصلاح دئے گئے ہیں۔ مرسلہ اختر صاحب جو ہر مبتدی و منتہی کے لئے مفید اور کارآمد ہیں۔

(۱) بغیر ترکیب جب جان کہو تو نون کا اعلان کرو، ہاں ترکیب فارسی میں اخفائے نون ضروری ہے۔

(۲) بے کلی فصیح نہیں خصوصاً اس لئے کہ یہ عورتوں کا اندرونی مرض ہے جو پہلوئے ذم رکھتا ہے۔

(۳) خدا مست، اچھی ترکیب نہیں، (خدا مست بمعنی مست مولیٰ)

(۴) کیسے بمعنی کیونکر پرانے (داغ اسیر تک نہیں لکھتے میں بھی نہیں لکھتا، مگر اب اکثر لکھنے لگے ہیں، لہٰذا یہاں توسیع زبان رہنے دیا۔

جاڑوں کی پہاڑ جیسی راتیں　　اب تم ہی بتاؤ کیسے کاٹیں"

(۵) سرھانے کی ہ مخلوط ہے مثلاً، کہیں نیچا نہ ہو اے گور سرھانا تیرا۔

(۶) ناراضگی کے مقابل ناراضی قابل نظر اور غیر فصیح ہے۔

(۷) عموماً سب الفاظ میں خصوصاً فارسی عربی الفاظ میں حرف کا دبنا بہت بُرا ہے۔

(۸) بڑے بڑے جگادری الفاظ لکھنا حماقت ہے۔

اصلاح بر کلام جناب صدیق حسن صاحب صدیقؔ مارہروی

صدیقؔ شبِ فرقت در و دیوار بھی آنکھیں دکھاتے ہیں ؛ مرے گھر میں بلائے آسماں معلوم ہوتی ہے

اصلاح نہ ہٹتی ہی مرے سر سے نہ جاتی ہی مرے گھر سے ؛ شبِ فرقت بلائے الخ

در و دیوار کے آنکھیں دکھانے سے، شبِ فرقت کا بلائے آسماں ہونا ثابت نہ تھا۔ نہ ہٹتی ہے مرے سر سے نہ جاتی ہے مرے گھر سے، کہکر شبِ فرقت کو بلائے آسماں ثابت کر دیا۔

صدیقؔ کبھی گورِ غریباں میں گذرتے ہیں تو کہتے ہیں   شہیدِ ناز کی تربت یہاں معلوم ہوتی ہے

اصلاح وہاں جاکر بدل جاتا ہی اندازِ خرام اُن کا   شہیدِ ناز کی تربت جہاں معلوم ہوتی ہے

صدیق صاحب کے شعر کا مفہوم نہایت معمولی اور پست تھا۔ استادِ کامل نے ایسی لطیف و وجد آفریں اصلاح دی جس سے زمینِ شعر کا پایہ آسمان سے مل گیا اور شعر سے لطافت و معنویت کے چشمے پھوٹ نکلے، سبحان اللہ وہاں جاکر بدل جاتا ہے اندازِ خرام اُن کا، ایسے پیارے لفظ ہیں جن کی داد کا دینا ممکن نہیں۔

صدیقؔ برابر بڑھ رہا ہوں منزلِ مقصود کی جانب   مری عمرِ رواں دامن کشاں معلوم ہوتی ہے

اصلاح نہ ٹھہرے میرے مرقد پر یہ کہکر خار و خس مجھ سے   یہاں کی خاک بھی دامن الخ

صدیق صاحب کے شعر میں منزلِ مقصود کی جانب بڑھنے کا اظہار کیا گیا تھا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمرِ رواں منزلِ مقصود ہی کی طرف کھینچی ہو یہ بھی واضح نہ تھا کہ منزلِ مقصود سے کیا مراد ہے، غرض شعر کچھ نہ تھا۔ اصلاحی صورت میں بہت نازک خیالی کا اظہار رہے۔ شعر حسرت کا مرقع ہو گیا۔ خس و خاشاک جیسی حقیر چیزوں کا وہاں کی خاک کے دامن کشاں ہونے کے خیال سے

نہ ٹھہرنا۔ اچھوتا خیال ہے۔

صدیق غزل صدیق کی سُنکر یہ سب اہل سخن بولے زبانِ بلبلِ ہندوستان معلوم ہوتی ہے

اصلاح تری دلکش سخنگوئی کا اے صدیق کیا کہنا زبان الخ

شعر میں صرف غزل کی نسبت کہا گیا تھا جو اصناف سخن میں سے صرف ایک چیز ہے سخنگوئی کا اطلاق تمام اصناف سخن پر ہے، سخنگوئی کو بھی دلکش کہا گیا ہے اس سے اور اہمیت پیدا ہوگئی آفریں کیا کہنا، کلمۂ توصیف کا اضافہ خاص طور پر لطیف ہے۔

صدیق عجب کیا ہی مقدر مرکزِ اصلی پہ پہنچا دے مددائے شوقِ منزل پانو اب گھر سے نکلتا ہے

اصلاح عجب الخ مددائے شوقِ منزل پانو اب باہر نکلتا ہے

پانو کا گھر سے نکلنا محاورہ نہیں ہے۔ پانو کا باہر نکلنا محاورہ ہے۔

صدیق دنیا مجھے قدرے جانا نہ کہہ رہی ہے دیوانہ بن گیا ہوں دیوانہ کہہ رہی ہے

اصلاح دنیا مجھے خرد سے بیگانہ کہہ رہی ہے دیوانہ الخ

قدرے جانانہ اور بات، دیوانہ اور جو خرد سے بیگانہ ہو اسی کو دیوانہ کہا جاتا ہے

صدیق گھر ہی نہ سائباں ہے بنیا دِ آشیاں ہے برقِ ستم اُسے بھی کاشانہ کہہ رہی ہے

اصلاح تنکے بچھے ہوئے ہیں دو چار آشیاں میں برقِ الخ

شعر میں پہلے تو گھر ہی کے وجود سے انکار تھا پھر سائبان کے وجود سے، جب گھر نہیں تو سائبان کا ذکر ہی بیکار تھا۔ آشیاں کا سائبان وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں، آشیاں میں تنکے ہی ہوتے ہیں۔ اصلاح میں تنکوں کا اظہار بڑی لطافت کے ساتھ، دو چار کہکر کر دیا اب شعر نہایت بلیغ ہو گیا مطلب یہ ہوا کہ آشیاں کو جس میں دو چار تنکے بچھے ہوئے ہیں، کیسی عجیب بات ہے کہ برق ستم اُسے بھی کاشانہ کہہ رہی ہے ایک کسر شعر میں یہ بھی تھی کہ مطلع کے علاوہ کسی شعر کے مصرعہ اولیٰ میں ردیف کا آخر میں آنا عیب ہے اس عیب کا نام اجتماع ردیفین ہے، یہاں پوری ردیف تو نہ آئی تھی صرف آخری جز آیا تھا اس کا آنا

بھی اچھا نہ تھا۔

صدیق میخوار کوئی شاید دنیا سے اٹھ گیا ہے — بگڑی ہوئی فضائے میخانہ کہہ رہی ہے

اصلاح دنیا سے اُٹھ گیا ہے میخوار کوئی شاید — بگڑی الخ

یہ غزل جس وزن میں ہے وہ اوزانِ مسجع میں سے ایک وزن ہے اس شعر کے پہلے مصرعہ کے آخر میں بھی ہے، تھا، لہٰذا مصرعہ کے دو برابر والے ٹکڑوں کو اِدھر سے اُدھر کرکے ہے کو مصرعے کے درمیان میں کر دیا، اور شعر بے عیب ہو گیا۔

صدیق اے عقل ہوش میں کیا جرم ہے محبت — دیوانی ہو گئی ہے دیوانہ کہہ رہی ہے

اصلاح الفت جنوں نہیں ہے اے عقل ہوش میں آ — دیوانی الخ

صدیق صاحب نے عقل سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ محبت جرم نہیں ہے اگر مان لیا جائے کہ محبت جرم ہے جب بھی اُس کا دیوانگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ جرم اور چیز دیوانگی اور بات، اصلاح میں، الفت جنوں نہیں ہے کہکر دیوانگی سے علٰحدہ کر دیا۔ اور مصرعے کے دونوں ٹکڑوں کو آپس میں بدل دیا اگر علیٰ حالہ رکھکر اصلاح دی جاتی تو وہی ہے آخر میں آتا تھا جو اوپر کے دو شعروں میں آپ کا تھا۔

صدیق کیا لَو اسے لگی ہے محفل میں جل رہی ہے — رو رو کے شمع حالِ پروانہ کہہ رہی ہے

اصلاح عاشق نوازیوں کا اک یہ بھی ہے طریقہ — رو رو الخ

اس شعر کے مصرعہ اولیٰ کے آخر میں ہی واقع تھا۔ اصلاح سے وہ بھی نکل گیا، شعر میں شمع کے محفل میں جلنے کو، رو رو کے حال کہنے سے تعبیر کیا گیا تھا حالانکہ رونا اور جلنا بالکل مختلف باتیں ہیں۔ اصلاح میں پہلا مصرعہ یوں بنایا گیا۔ عاشق نوازیوں کا اک یہ بھی ہے طریقہ، یہاں رو رو کے حالِ پروانہ کہنا بصورت اظہار واقعہ ہو گیا۔ اب جو مصرعہ ثانی پر مصرعہ لگایا گیا ہے اُس کی معنویت و بیساختگی قابل ملاحظہ ہے۔

صدیق بلبل کی نغمہ سنجی سمجھا نہ کوئی اب تک — وہ دردِ دل کا میرے افسانہ کہہ رہی ہے

اصلاح   بلبل کی نغمہ سنجی ہے میری نوحہ خوانی   وہ الخ

بلبل کی نغمہ سنجی سمجھانہ کوئی اب تک کہنے سے، دردِ دل کا افسانہ کہنا کچھ بے تک سا تھا۔
اصلاح میں نغمہ سنجی کو نوحہ خوانی سے تعبیر کرکے، دردِ دل کا افسانہ کہنے کے عین مطابق کر دیا۔

اصلاح بر کلام راؤ بہادر کنور حاجی عبدالحمید خاں صاحب منظرؔ رئیس باغپت ضلع میرٹھ

منظرؔ   قتل میں کیا سوچتا ہے کھینچ لو شمشیر بھی   تم اگر بھولے ہو مجھ سے پوچھ لو تقصیر بھی
اصلاح   سوچ کیا ہے قتل میں اٹھو بھی لو شمشیر بھی   تم الخ

حضرت قبلہؒ کا نوٹ آپ کے مصرع میں ردیف جمی نہیں تھی۔

اصلاح سے ردیف بھی کارآمد ہوگئی اور شعر میں روانی بھی پیدا ہوگئی۔

منظرؔ   بیکسی کو دیکھ کر میری رُکا دستِ ستم   کچھ چلی کچھ رہ گئی شمشیر بھی تکبیر بھی
اصلاح   بیکسی پر میری اُن کے دست و لب دونوں ہلے   کچھ الخ

صرف دستِ ستم کہنے سے تکبیر کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا، دست ولب دونوں ہلے
نے شمشیر اور تکبیر دونوں کی طرف کافی اشارہ کرکے شعر کی کمی کو پورا کر دیا۔

منظرؔ   منتیں جتنی کریں اتنا ہی وہ کھنچنے لگا   ہائے الٹی ہوگئی تاثیر بھی تقدیر بھی
اصلاح   منتیں کیں جس قدر اتنا الخ   ہائے الخ

نوٹ۔ کریں متروک ہے۔

منظرؔ   یا خدا کیا ہونے والا ہے کہ سب خاموش ہیں   یاس بھی حسرت بھی ارماں بھی مری تقدیر بھی
اصلاح   یا خدا الخ   آس بھی

نوٹ۔ یہاں یاس مناسب نہیں اور حسرت کے معنی آرزو کے ہیں۔

منظرؔ   فصلِ گل آتے ہی وحشی کی ترے وحشت بڑھی   پیرہن ٹکڑے کئے توڑی وہیں زنجیر بھی
اصلاح   فصلِ گل آتے ہی وحشی کی یہ وحشت بڑھ گئی   پیرہن بھی پارہ پارہ ہوگیا زنجیر بھی

نوٹ پیرہن کے لئے پارہ ہونا فصیح ہے۔

اوّل تو پیرہن کے لئے پارہ ہونا فصیح ہے جیسا کہ حضرت قبلہؒ کے نوٹ سے واضح ہو دوسرے ٹکڑے ہی کرنا اگر ہوتا تو پیرہن کے ٹکڑے کئے ہوتا نہ کہ پیرہن ٹکڑے کئے، پیرہن واحد ہے جمع نہیں ہے۔

منظر خواب میں پہلو میں تھے آنکھیں کھلیں تو کچھ نہ تھا : شب کو جو دیکھا تھا اس کی دیکھ لی تعبیر بھی
اصلاح خواب میں تھے ہم بغل آنکھیں الخ شب الخ

پہلو میں ہونے سے ہم بغل ہونا زیادہ لطیف ہے۔

منظر یوں شب فرقت میں منظر یاد کرتا ہوں انھیں دل میں رہتا ہے تصوّر سامنے تصویر بھی
اصلاح اُن کو منظر یوں شب فرقت کیا کرتا ہوں یاد دل الخ

نوٹ۔ شب فرقت میں، صحیح نہیں صرف شب فرقت فصیح ہے۔

اصلاح بر کلام جناب صغیر احمد صاحب صغیر جلال آبادی

صغیر ترتیب دے رہے ہیں وہ زلفِ سیاہ کو یا دیکھتا ہوں ابر کے دامن میں ماہ کو
اصلاح کھولا ہے اس نے چہرے پہ زلف سیاہ کو یا الخ

نوٹ ترتیب دینا زلف کے لئے اچھا نہیں معلوم ہوا۔

اوّل تو زلف کا ترتیب دینا اچھا نہیں تھا دوسرے اگر اچھا بھی ہوتا تو ترتیب دینے کا مطلب، چہرے پر بکھرنا نہیں ہو سکتا تھا، جب تک زلف کا چہرے پر ہونا نہ کہا جائے ابر کے دامن میں ماہ کا ہونا ثابت نہیں ہوتا معمولی سی ترمیم سے صغیر صاحب کا مفہوم خوش اسلوبی سے ادا ہو گیا۔

صغیر رقص میں بادِ صبا ہے گل میں کیفِ جام ہے فصلِ گل ہے یا صلائے رندِ آشام ہے
اصلاح رقص الخ فصلِ گل ہے یا صلائے بادۂ گلفام ہے

نزاکتِ اصلاح ملاحظہ ہو۔ رندِ آشام کی جگہ، بادۂ گلفام بنایا گیا، اے سبحان اللہ ہر گل میں کیفِ جام کے ساتھ، صلائے بادۂ گلفام کو جس قدر مناسبت ہے وہ کسی اور لفظ کو

نہیں ہو سکتی۔

صغیر نہ روئیں میری میت پر یہ کہدو سوگواروں سے فدا کارانِ الفت کی بقا ہی تیغ قاتل ہے
اصلاح نہ روئیں الخ کہ جاں بخش اپنے جاں بازوں کے حق میں تیغ قاتل ہے

فدا کارانِ الفت کی بقا ہے تیغ قاتل سے اگر کہا جاتا تو ایک حد تک صحیح بھی ہوتا۔ اصلاً شعر میں ردیف کا استعمال درست نہیں تھا، اور یہ بات جو اصلاح سے پیدا ہوگئی، فدا کارانِ الفت کی بقا ہی۔ تیغ قاتل سے، کہنے میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی، نہ روئیں میری میت پر یہ کہدو سوگواروں سے، کہنے کے بعد کہ جاں بخش اپنے جاں بازوں کے حق میں تیغ قاتل ہے۔ کیسے پیارے الفاظ میں تلقین صبر ہے۔

صغیر تا بکے یہ جاں ستانی اے گناہِ آرزو ایک دل تھا وہ ہی میں نے نذرِ قرگاں کر دیا
اصلاح تا بکے یہ گریہ سامانی کہاں تک جوش غم خون دل جتنا تھا میں الخ

ایک تو دل کا نذر قرگاں ہونا، اور ایک خون دل کا نذر قرگاں ہونا بڑا فرق رکھتا ہے خونِ دل کا نذر قرگاں ہونا بالکل صحیح، اور خون کے نذرِ قرگاں ہونے کے لئے گریہ نہایت ضروری تھا۔ تا بکے یہ گریہ سامانی کے بعد کہاں تک جوش غم، کے ٹکڑے نے شعر میں اور بھی مناسبت کی روانی اور کیفیت پیدا کر دی صغیر صاحب کے شعر میں وہ ہی بھی غیر فصیح تھا فصحا دہی لکھتے ہیں۔

صغیر ربابِ دل یہ ہیں مضرابِ غم کی کاوشیں پیہم رہے گا دیکھئے کب تک نظام جسم وجاں باقی
اصلاح ربابِ دل یہ ہیں مضرابِ غم کی ضربتیں پیہم رہے گا دیکھئے کب تک یہ ساز جسم وجاں باقی

اصلاح میں کاوشیں کی جگہ ضربتیں اور نظام کی جگہ یہ ساز بنایا گیا ہے، رباب ایک ساز کا نام ہے ساز کے لئے کاوش کا استعمال کچھ نہیں، اور ضرب کا سب کچھ، ساز کے چھڑنے کے لئے ضرب یعنی چوٹ نہایت ضروری چیز ہے۔ دوسرے مصرعے میں رباب کی نسبت سے ساز بنایا گیا ہے۔ یہ لفظ نظام، ساز سے زیادہ برمحل نہ تھا۔

صغیر قیودِ زندگی توڑی نظامِ جسم وجاں بدلا رہیں پھر بھی دلِ مجبور کی مجبوریاں باقی
اصلاح قیود زندگی توڑیں نظام الخ رہیں الخ

قیود جمع ہے اس لئے توڑیں چاہئے۔

صغیر دل چرایا صبر لوٹا پھر بنے پرسانِ حال اللہ اللہ کیا مذاقِ عارفانہ یاد ہے
اصلاح دل الخ اللہ اللہ کیا سلوک الخ

صرف ایک لفظ بدلا گیا مذاق کی جگہ سلوک کی معنویت کا کیا کہنا۔ مدارجِ عرفان میں ایک جذب ہے دوسرا سلوک اس نسبت سے بھی سلوک کا استعمال بہت خوب ہے اور برتاؤ کے معنی میں بھی کیا کہنا۔

صغیر دل لگانے سے ملے حسن کی سرکار سے یہ درد وغم، رنج والم، نالہ و فریاد مجھے
اصلاح دے کے دل حسن کی سرکار سے انعام ملے درد الخ

ایک تو خالی دل لگا کر درد وغم وغیرہ کا ملنا اور ایک انعام میں ملنا بڑا فرق رکھتا ہے اصلاح سے شعر میں کافی ترقی پیدا ہوگئی۔

صغیر تارِ نفس فراق میں نغمۂ سوز وساز ہو پھر مجھے ہم جلیس کیوں حاجتِ نے نواز ہو
اصلاح تار نفس جو ہجر میں زخمۂ سوز وساز ہو پھر الخ

نوٹ۔ تار نفس کی تشبیہ نغمے سے بغیر وجہ تشبیہ کے ہے اسی لئے زخمہ (مضراب) بنایا گیا۔

حضرت قبلہؒ کے نوٹ سے نغمہ کی جگہ زخمہ بنانے کی ضرورت تو واضح ہوگئی۔ اس کے علاوہ فراق کی جگہ جو ہجر بنایا گیا ہے، دوسرے مصرعے میں کہا گیا تھا، پھر مجھے ہم جلیس کیوں حاجتِ نے نواز ہو، یہ کیوں، کسی حرف شرط کا محتاج تھا یہ کمی فراق کی جگہ جو ہجر بنانے سے پوری ہوگئی۔

صغیر دکھا کر اک جھلک موسیٰ کو جس نے کر دیا بیخود اسی کی جستجو میں منہمک ہیں تیلیاں میری
اصلاح دکھا کر الخ اسی کی جستجو میں پھر رہی ہیں تیلیاں میری

جستجو میں پھرنا نہایت ضروری ہے، منہمک ہونے میں وہ بات کہاں جو پھرنے میں ہے۔
تیلیوں کے ساتھ پھرنے کا استعمال، کیا کہنا ہے۔

صغیر کھنچدی ہے ذرہ ذرہ پر تری تصویر دیکھ ہر نگاہِ شوق میری صنعتِ بہزاد تھی
اصلاح کھنچدی ہی ذرہ ذرہ پر تری تصویرِ حسن ہر نگاہِ شوق میری روکشِ بہزاد تھی

دیکھ کی جگہ حسن بنایا گیا، دیکھ حشو تھا، حسن، تصویر کے ساتھ ملکر معنی خیز ٹکڑا ہوگیا، دوسرے مصرعے میں صنعت کی جگہ روکش بنایا گیا، ظاہر ہے کہ بہزاد ایک مصور تھا، اور اس کی صنعت، تصویر کشی، نگاہِ شوق کو صنعتِ بہزاد کہنا صحیح نہیں تھا، اور صغیر صاحب کا یہ مطلب کہ ہر نگاہِ شوق نے ذرہ ذرہ پر تری تصویر کھنچدی ہے، نگاہِ شوق کو صنعتِ بہزاد کہنے سے پورا نہیں ہوتا تھا، بہزاد مصور تھا اس میں تو کوئی شبہ نہیں، لیکن کوئی مصور ذروں پر تصویریں نہیں کھینچ سکتا یہ کام مصوری سے بالاتر ہے لہذا استاد کامل الفن نے صرف ایک لفظ روکش سے اس اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔ روکش کے معنی ہیں شرمندہ کرنے والا۔

اصلاح بر کلام منشی احمد بخش صاحب آبر گنوری

آبر پہلو میں مرے غم کا ہی حاصل نہ سمجھنا کونین کا حاصل ہے اسے دل نہ سمجھنا
اصلاح پہلو میں فقط رنج کا حاصل نہ سمجھنا کونین الخ

آبر صاحب کے مصرع میں کا ہی ذرا دبکر نظم ہوا تھا اور ہی کی یائے معروف گر جانے سے ہائے ہوز کے بعد حاصل کی حائے حطی تھی اِن کا اجتماع بھی اچھا نہ تھا۔ مرے بھی بے ضرورت تھا، ذراسی ترمیم سے شعر درست ہوگیا اور روانی بھی پیدا ہوگئی۔

آبر مظلوم ہی رسم وفا توڑ نہ مجھ سے بیداد ہے بیداد کے قابل نہ سمجھنا
اصلاح ایذا طلبی فطرتِ عاشق میں ہے داخل بیداد الخ

ترک بیداد کو بیداد کہا گیا تھا، اس لئے رسم وفا نہ توڑنے کی درخواست بے تک

تھی، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لفظ وفا کی جگہ جفا بنا دیا جائے مگر اس سے فطرتِ عاشق کا اظہار نہ ہوتا اور یہاں فطرتِ عاشق کے اظہار کی ضرورت تھی ایذا طلبی فطرتِ عاشق میں ہی داخل، نہایت بلیغ اصلاح ہے۔

آبر	ہر چیز کہ درکانِ نمک رفت نمک شد	پیکاں ہے ترا آرزوئے دل نہ سمجھنا
اصلاح	ہر چیز الخ	پیکاں یہ تمہارا ہے اسے دل نہ سمجھنا

ظاہر ہے کہ پیکاں محبوب دل میں داخل ہوتا ہے نہ کہ آرزوئے دل میں، لہذا پیکاں کو 'بمصداق' ہر چیز کہ درکان نمک رفت نمک شد دل سمجھا جا سکتا تھا نہ کہ آرزوئے دل' اصلاح سے آبر صاحب کا مفہوم نہایت واضح طور پر ادا بھی ہو گیا اور انداز ادا میں شگفتگی بھی پیدا ہو گئی۔

آبر	اجڑے ہوئے ارمانوں کے کچھ نقش ہیں باقی	لوٹی ہوئی بستی ہے اسے دل نہ سمجھنا
اصلاح	لوٹے ہوئے الخ	اجڑی ہوئی الخ

یہ اصلاح' اصلاح نہیں ہے' اعجاز ہے' صرف اجڑے کی جگہ لوٹے اور لوٹی کی جگہ اُجڑی بنایا گیا ہے گویا تذکیر و تانیث کا لحاظ کرتے ہوئے دو لفظوں کو اِدھر سے اُدھر رکھ دیا ہے، اس معنی خیز رد و بدل کی کیا تعریف ہو' حقیقت یہ ہے کہ وہ شے اجڑتی ہے جو ظرف ہو' ارمان ظرف نہیں مظروف ہیں' مظروف کو لوٹا جا سکتا ہے۔ لہذا ارمانوں کو لوٹے ہوئے کہا گیا، اجڑے ہوئے صحیح نہ تھا، اور اگر یہ صحیح بھی ہوتا تو پہلے ارمانوں کو اجڑے ہوئے کہا تھا، پھر بستی کو لوٹی ہوئی، ضرورت تھی کہ لوٹ پہلے ہو پھر اجاڑ کی شے کو لٹ جانے سے پہلے اجڑا ہوا نہیں کہہ سکتے، بستی کو لوٹا ہوا کہنا بھی صحیح ہے اور اجڑا ہوا کہنا بھی درست ہے، لیکن لوٹا ہوا کہنا اس درجہ قابلِ التفات نہیں جتنا اجڑا ہوا ہونا ہے اجڑے ہوئے میں زیادہ حسرت کا اظہار ہوتا ہے۔

آبر	کیا جانئے آبر اس کا محبت میں ہے کیا نام	منزل پہ پہنچکر اُسے منزل نہ سمجھنا

اصلاح کہتا ہے مرا شوقِ طلب آبرؔ یہ مجھ سے — منزل بھی جو مل جائے تو منزل نہ سمجھنا

آبرؔ صاحب کا شعر کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اصلاح سے رواں ہوگیا اور فراوانیٔ شوقِ طلب کا اظہار بڑی لطافت سے پیدا ہوگیا۔

آبر نکلی ہی کیوں تھی منہ سے بتا نامراد آہ — عالم ہی تجھ سے جب تہ و بالا نہ ہو سکا

اصلاح نکلی ہی کیوں تھی منہ سے بتا آہِ نامراد — عالم الخ

نامراد آہ میں وہ سلاست کہاں جو آہِ نامراد میں ہے، وہی لفظ ہیں ذرا اِدھر اُدھر کر دینے سے شعر سلیس ہوگیا۔

آبر اُٹھتا بھی کس سے ہجر میں الزامِ زندگی — اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہو سکا

اصلاح اُٹھتا نہ مجھ سے الخ — اچھا الخ

مصرعہ ثانی میں اپنے اچھے نہ ہونے کا ذکر کیا تھا اس لئے کس سے موزوں نہ تھا اور بھی حشو تھا لہٰذا بھی کس سے کی جگہ نہ مجھ سے بنایا گیا اب شعر میں روانی پیدا ہوگئی۔

آبر ہلکا سا اک حجابِ نظر تھا جنابِ قیس — غفلت نے جس کو پردۂ محمل بنا دیا

اصلاح اے قیس وہ فریبِ حجابِ نگاہ تھا — غفلت الخ

ہلکا سا، حشو قبیح تو نہ تھا مگر حشو ضرور تھا، پھر کہاں حجابِ نظر، کہاں فریبِ حجابِ نگاہ،

آبر مجھ کو تو اس کا ہوش نہیں تم ہی کچھ کہو — بسمل میں ہوگیا ہوں کہ بسمل بنا دیا

اصلاح مجھ کو تو اس کا ہوش نہیں ہے تمھیں کہو — بسمل الخ

نوٹ۔ تمھیں فصیح ہے۔

تم ہی کی جگہ ہے تمھیں، بنانے سے تم ہی جو غیر فصیح تھا، نکل گیا اور شعر میں فصاحت پیدا ہوگئی۔

آبر ہائے اِن دُہری بلاؤں میں اسیرانِ وفا — قیدِ ہستی کی مصیبت اور زندانِ وفا

اصلاح دو بلاؤں میں پھنسے ہیں ہم اسیرانِ وفا — قیدِ ہستی الخ

شعر میں اسیرانِ وفا کا اطلاق واضح طور پر اپنے لئے نہیں ہوتا تھا، اصلاح سے خود کو اسیرانِ وفا کہنا واضح ہوگیا، اور اسیرانِ وفا کے لئے پھنسے ہیں ملاحظہ طلب ہے۔

آبر جانتا ہوں جور کو بھی اُن کے میں جانِ وفا ہو چلا ہے عشق میں اب مجھ کو عرفانِ وفا
اصلاح کیوں نہ سمجھیں ہم جفا کو بھی تری جانِ وفا ہے یہ عرفانِ محبت ہے یہ ایمانِ وفا

ایک تو کسی بات کو معولاً جاننا اور ایک اس طرح جاننا کہ اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہ ہوسکے، بڑا فرق رکھتا ہے، اصل شعر اور اصلاح میں یہی فرق ہے، دوسرے مصرع میں آبر صاحب نے صرف عرفانِ وفا کا ذکر کیا تھا، اصلاح میں ایک لطیف اضافہ ہوگیا، جو بات داخلِ ایمان ہو اس سے کون انحراف کرسکتا ہے۔

آبر دیکھ دستِ جور اس کا بھی رہے تجھکو خیال تیرے جھٹکے چاک کر ڈالیں نہ دامانِ وفا
اصلاح دستِ وحشت سے رہا کرتا ہی یہ کھٹکا مجھے اس کے جھٹکے الخ

دستِ جور سے جھٹکوں کا واسطہ اگر ہو بھی سکتا ہو تو اتنا قریبی نہیں، جتنا دستِ وحشت سے ہوسکتا ہے۔ چاک دامانی دستِ وحشت کا خاص کام ہے، اور جھٹکے کے لئے کھٹکا کتنی لگتی ہوئی بات ہے، یہ لطافت خیال میں کہاں، اصلاح سے شعر سلیس و روان ہوگیا۔

آبر بعد میرے وہ بھی ترسینگے وفا کے نام کو ہو رہیگا ایک دن اُن کو بھی عرفانِ وفا
اصلاح وہ بھی میرے بعد ترسینگے الخ ایک دن ہو جائیگا اُن الخ

نوٹ۔ ہو رہیگا غیر فصیح ہے۔

پہلے مصرع میں تھا، بعد میرے وہ بھی، اس میں تعقید تھی، وہ بھی میرے بعد، کہنے سے تعقید کھل گئی، دوسرے مصرع کی اصلاح کا سبب حضور سیدیؒ کے نوٹ سے واضح ہے۔

آبر کہہ کے یہ تلقینِ شیون کرتے ہیں مجھ کو طبیب خونِ دل او خوگرِ ضبطِ فغاں ہو جائے گا
اصلاح کہہ کے الخ خونِ دل اے خوگر الخ

نوٹ۔ او اشارہ مخاطب بعید کو اور اے مخاطب قریب کو چاہئے۔

آبرؔ زلزلے آگئے جو کیں آہیں بارہا آزما کے دیکھ لیا

اصلاح زلزلے آئے جب گئے نالے بارہا الخ

مصرعہ ثانی میں بارہا آزمانے کا ذکر تھا، لیکن مصرعہ اولیٰ کی ترتیب سے یہ بات ثابت نہ تھی، اصلاح میں اور ترمیم کے ساتھ جب بنا کر اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ یہاں جب کے معنی، جب کبھی کے ہیں۔

آبرؔ ہوئی تسکین نہ خوں رونے سے رنگ یہ بھی جما کے دیکھ لیا

ہوئی تسکین نہ خوں فشانی سے رنگ الخ

خوں رونے سے خوں فشانی کہیں بہتر ہے۔

آبرؔ دیکھے خوب یہ ہے لاش اسی بیکس کی جس دل کا کوئی تا زیست نہ ارماں نکلا

اصلاح دیکھ الخ جیتے جی دل سے نہ جس کے کوئی ارماں نکلا

تا زیست میں فارسیت تھی، جیتے جی خالص اردو روزمرہ ہے فصحا اُردو روزمرہ اور اردو الفاظ کا استعمال بہتر سمجھتے ہیں۔

آبرؔ جامہ زیبی مری دحشت میں کوئی کیا کرتا آستین سِل نہ چکی تھی کہ گریباں نکلا

اصلاح جامہ دوزی مری الخ آستین الخ

مصرعہ ثانی میں سلنے کا ذکر تھا، اس لئے جامہ دوزی سے معنویت میں اضافہ ہوگیا،

آبرؔ نہ پوچھ اے چارہ گر غم کی خلش سے کیا گزرتی ہے یہ ہے وہ پھانس دل پر کام کرتی ہے جو پیکاں کا

اصلاح نہ پوچھ الخ یہ ہے وہ پھانس دل میں کام الخ

پھانس اوپر رہنے والی چیز نہیں اس لئے پر کا استعمال غلط تھا، لہٰذا پر کی جگہ میں بنایا گیا۔

آبرؔ یہی شغل آبرو حشت سے رہا زنداں میں مدت تک بنایا اور بگاڑا خاک پر نقشہ بیاباں کا

اصلاح رہا دستِ جنوں کا مشغلہ یہ ابر زنداں میں بنایا الخ

مدت تک کہنے سے یہ بات ثابت نہ تھی کہ جب تک زنداں میں رہے خاک پر بیاباں کا

نقشہ بنانے اور بگاڑنے کا مشغلہ جاری رہا خیال یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کچھ زمانہ اس شغل سے خالی بھی رہا دوسرے نقشہ بنانے اور بگاڑنے کا کام ہاتھ ہی کا ہوسکتا ہے، رہا دستِ جنوں کا مشغلہ یہ آبر زندان میں، کہنے سے پہلی کمی بھی پوری ہوگئی اور دوسری ضرورت بھی۔

آبر — پار ہونا بحرِ الفت سے تو کچھ مشکل نہ تھا — جو کہیں ڈوبا وہیں پر اس کو ساحل ہوگیا

اصلاح — پار ہوتے بحرِ الفت سے یہ مشکل تھا مگر — ڈوبنے والوں کو ہر گرداب ساحل ہوگیا

پہلے مصرع کی ترمیم سے ترقی پیدا ہوگئی، مصرعہ ثانی میں، وہیں پر تھا، وہیں پڑ میں پر حشو ہے اس لئے وہیں پر متروک ہے وہیں بولتے ہیں اصلاح سے یہ عیب بھی نکل گیا! در پھر ہر گرداب کی معنویت کا کیا کہنا

اصلاح بر کلام غلام احسن راز احسنی سہسوانی

راز — فرقت میں امنڈتا ہے لہو دیدہ و دل سے — لبریز مے ناب ہیں یہ جامِ تمنا

اصلاح — فرقت الخ — لبریز مے غم ہیں خم و جامِ تمنا

فرقت میں دیدۂ و دل سے امنڈے ہوئے لہو کو مے ناب سے تشبیہ نہایت واہیات تھی، مے غم کی مناسبت و معنویت کا کیا کہنا، پھر دیدہ و دل دونوں کو جام سے تشبیہ دی تھی، اُس کی جگہ استاد کامل الفن نے خم و جام رکھدیا، اس قسم کی اصلاحیں معمولی اساتذہ نہیں دے سکتے "جو دو دو کوڑیوں کے شعروں کو معمولی ترمیمات سے بے بہا بنا دیں۔

راز — مقدر میں یہ کیا شے کارفرمائے جہاں رکھدی — دیا دل یا مرے سینے میں اک برقِ تپاں رکھدی

اصلاح — مقدر الخ — مرے سینے میں دل رکھا ہی یا برق تپاں رکھدی

مصرعہ ثانی میں زبردست تعقید تھی، اور ایک خرابی یہ بھی تھی کہ دینا اور رکھنا علیحدہ علیحدہ باتیں تھیں، اصلاح سے تعقید بھی دور ہوگئی اور دل رکھا ہے یا برق تپاں رکھدی، کہنے سے دونوں جگہ رکھنا ہوگیا شعر میں روانی پیدا ہوگئی۔

راز — تری تسبیح کرنے کے لئے شبنم سے منہ دھوکے — چمن کی ہر کلی جب صبح ہوگی باوضو ہوگی

اصلاح تری تسبیح کرنے کے لئے شبنم سے منہ دھوکر   چمن الخ

نوٹ۔ اسس ہو کے لکھنؤ والوں کا ایجاد ہے دلّی والے اس کو فصیح نہیں سمجھتے اور میں اُنھیں کا مقلّد ہوں۔

راز جہاں تک ہو سکے ارماں نہ آنے دے کوئی دلمیں ؛ تمناؤں سے دل کا دور ہو جانا ہی جنت ہے

اصلاح جہاں الخ   تمناؤں سے دل کا پاک ہو جانا ہی جنت ہے

صرف ایک لفظ دور کی جگہ پاک بنایا گیا سبحان اللہ کس قدر پاکیزہ اصلاح ہے۔

۷۸۶

"حسن"

از امید رضوی بریلوی۔

آج احسن بھی اجل کی وادیوں میں کھو گیا
شاعر و اکبر کا غم اس غم سے تازہ ہو گیا

شاعرِ جادو بیاں وہ طوطیٔ شیریں مقال
تا حدِ عرشِ بریں تھی جس کی پروازِ خیال

عالمِ اسباب میں زندہ نشانی داغ کی
جسکے شعروں میں جھلکتی تھی کہانی داغ کی

جس کی فکرِ چرخ پیما ہمسرِ جبریل تھی
قوتِ تخئیل جس کی شہپرِ جبریل تھی

آشنائے رازِ فطرت جس کی چشمِ جستجو
جسکی نظریں رازدارِ گلستانِ رنگ و بو

نثر میں جس نے بہائے قلزمِ آبِ حیات
لکھ کے تاریخِ ادب اُردو کو بخشا ہے ثبات

جس کے نغموں سے گلستانِ سخن گونجا کیا
آج ہے خلد آشیاں وہ بلبلِ شیریں نوا

گلستانِ شاعری اُجڑا ہوا سا باغ ہے
آج وہ باغِ ارم میں ہم صفیرِ داغ ہے

آسماں اب کون کر دے گا زمینِ شعر کو
اب مرصع کون کر دے گا جبینِ شعر کو

کون اب سمجھے گا مفہومِ فغانِ عندلیب
کون اب کھولے گا اسرارِ بیانِ عندلیب

بادہ افشانی کرے گی کس کی فکرِ نکتہ رس
کون ہے ساقی نچوڑے گا جو انگوروں سے "رس"

چٹکیاں سی دل میں لیگا کس کا اندازِ کلام
کون ہے اب وہ سنائے گا جو فطرت کا پیام

اب نیاز و ناز کی سمجھائے گا تفسیر کون
"اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون"

کارنامۂ غم

جناب جوش صاحب ملسیانی
ایڈیٹر رسالہ رہنمائے تعلیم، لاہور

جناب احسن مارہروی مرحوم نے اپنے مذہبی خیالات اور اُس راسخ الاعتقادی کو جس کی روشنی میں اُنھوں نے اپنی عمرِ عزیز بسر کی اور جس کی برکت سے انھیں بہت سا روحانی فیض حاصل ہوتا رہا۔ اور جسے وہ وقتاً فوقتاً منظوم بھی فرماتے رہے۔ اپنی وفات سے تقریباً دو سال پہلے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ کارنامۂ غم اسی مجموعۂ افکار کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۵۷ھ کے اعداد مستخرج ہوتے ہیں۔

اصنافِ سخن کے لحاظ سے اس مجموعۂ کلام کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے پہلے حصّے میں رباعیات ہیں۔ دوسرے میں سلام اور تیسرے حصّے میں متعدد خمسے اور تضمینیں ہیں۔ آخر میں خدمتِ مخلوق کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ موضوعِ سخن کے لحاظ سے یہ نظم بھی اسی مجموعۂ کلام کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔

پیشتر اس کے کہ کسی مذہبی تصنیف پر کوئی تبصرہ ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ یہ نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ عام مذہبی نظموں کی تصنیف میں شاعر کا میدانِ خیال غزل کی طرح لامتناہی و غیر محدود نہیں ہوتا۔ اور سلسلۂ کلام اگر واقعاتِ کربلا ہی سے مختص ہو۔ تو یہ میدان اور بھی تنگ تر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پابندی اور بھی دشواری پیدا کرتی ہے۔ کہ بزرگانِ دین کی شان میں ادب و احترام کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اور اس مجبوری کی وجہ سے ذخیرۂ الفاظ کی فراوانی بھی قوتِ بیانیہ کی مدد کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ غزل اور سلام کا مقابلہ کرتے وقت ان مشکلات کو نظر انداز کر دینا سراسر بے انصافی ہے۔ کسی شاعر کا سلام بہ لحاظ خوبیِ کلام اگر اس کی غزل کا ہم پایہ و ہم پلّہ ہو۔ تو ان مشکلات اور پابندیوں کی وجہ سے جنکا

ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ سلام بہ مقابلہ غزل زیادہ تحسین و توصیف کا مستحق ہے۔ اور اسی امتیازی وصف سے کسی شاعر کی قادر الکلامی و کمالِ شاعری پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ رباعیات کی تنقید میں بھی یہی نظریہ قابلِ لحاظ ہے۔ وجہ یہ کہ عام قسم کی رباعی کے لئے تلاشِ مضمون کی زحمت کسی خاص حد تک محدود نہیں ہوتی۔

احسن مرحوم اپنے ذوقِ سخن و کمالِ فن کو صرف غزل گوئی تک محدود نہ رکھتے تھے۔ ان کے ذخیرۂ کلام میں ایسے مضامین بھی کثرت سے ہیں۔ جنہیں ملک و ملت کے لئے درس آموز و بصیرت افروز کہنا چاہیئے۔ مثلاً انہوں نے ایک رباعی میں ذوقِ سخن کا صحیح استعمال اسطرح بیان فرمایا ہے ؎

احسن نہ کبھی زمانہ سازی کیجئے مثلِ شعرا نہ شعر بازی کیجئے
ہے ذوقِ سخن اگر تو صدقِ دل سے مدّاحِ سلطانِ حجازی کیجئے

جو شاعری صرف نوجوانوں کو خوش کرنے کے لئے ہو اور جس میں عُریانی مضامین کی فراوانی دانستہ پیدا کی گئی ہو۔ اسے زمانہ سازی بلکہ شعر بازی سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ استہزا ان کے میلانِ طبیعت کا پتہ دیتا ہے۔ تیسرے مصرع میں ذوقِ سخن کے صحیح صرف پر توجہ دلانے کے لئے صدقِ دل پر بھی اصرار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ سے یہ ہدایت اتنی غیر مشروط ہو گئی ہے۔ کہ کوئی استثنا باقی نہیں رہا اور اس پر عمل کرنے کے لئے اس سے زیادہ تاکید دوسرے الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ چوتھے مصرع میں لفظ مدّاحی بالکل استادانہ ہے۔ یہاں تعریف یا توصیف بھی آ سکتا تھا۔ مگر صیغۂ مبالغہ نے مدح کی وسعت انتہا تک پہنچا دی ہے۔

رباعیات کی تعداد اس مجموعہ میں ۳۶ ہے۔ ان میں متعدد رباعیات ایسی ہیں جنہیں حُسنِ سخن کی جان اور خوش بیانی کا ایمان کہنا چاہیئے۔ مثلاً ؎

کی الفتِ پنجتن ہمارے جی نے معمور ہیں نورِ حق سے اپنے سینے
احمدؐ حیدرؑ بتولؑ شبّرؑ شبیرؑ ہیں منزلِ واحد کے یہ پانچوں زینے

مصرعے اول میں قافیہ معمول کی خوبی ملاحظہ ہو۔ باقی دونوں قوانی بھی بہت چست بلکہ ناطق ہیں۔ پنجتن اسلامی زبان میں اتنا معروف لفظ ہے۔ کہ محتاجِ تفصیل نہیں۔ مگر پھر بھی مصنف نے تیسرے مصرعے میں اس تفصیل کی مشکلات میں پڑنا منظور کیا۔ وزن۔ بحر۔ صحت لفظی کی پابندیوں سے مختلف نام شعر یا مصرعے میں لانا بڑا مشکل کام ہے۔ اور رباعی کے وزن میں یہ مشکل اور بھی قافیہ تنگ کرتی ہے۔ پھر ان اسما کو ایک خاص ترتیب سے بیان کرنے میں اگر کوئی شاعر کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو اسے اعجازِ بیان کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ احمدؐ حیدرؑ بتولؑ شبرؑ شبیرؑ۔ حفظِ مراتب کے لحاظ سے یہ ترتیب قابلِ غور ہے۔ وزن پورا کرنے کے لئے حرفِ عطف کی ضرورت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ حیرت کا مقام ہے کہ یہ مصرع اس شان کا کیونکر مرتب ہوا۔ چوتھے مصرع میں پانچوں کے لحاظ سے اسمائے الٰہی میں سے لفظ واحد کو منتخب کرنا کیا لطف پیدا کر رہا ہے، اس رباعی کو پڑھکر مندرجہ ذیل رباعی کا چوتھا مصرعہ خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں اور بالکل بجا فرماتے ہیں ؎

سبطین کا وابستۂ دامن ہوں میں	کونین کے فکر و غم سے ایمن ہوں میں
وصفِ حسنؑ و حسینؑ پڑھ کر سر بزم	احسنت نہ کیوں سنوں کہ احسن ہوں میں

ظالم کا نام تک باقی نہیں رہتا۔ اور نیک آدمی اپنی نیکی کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اس مضمون کو سعدی نے بھی اس طرح بیان کیا ہے ؎

قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت	نوشیروان نمرد کہ نام نکو گزاشت

جناب احسن نے بھی یہی مضمون ایک جگہ سپردِ قلم کیا ہے۔ مگر ملاحظہ ہو کہ یہ پامال مضمون زورِ بیان سے کہاں پہنچا دیا ہے ؎

لیتا ہے شقی کا نام کب کوئی کہیں	لیکن لقبِ نیک ہے ہر دل میں مکیں
ہے نامِ بد و نیک کی نسبت کا یہ فرق	لاکھوں ہیں حسینؑ اور یزید ایک نہیں

لاکھوں ہیں حسینؑ اور یزید ایک نہیں۔ اللہ اللہ۔ یہ مصرع کس زور کا ہے۔ اچھے اور

برے نام کی نسبت کا فرق اس سے زیادہ کوئی کیا بیان کرسکے گا۔ پیش پا افتادہ واقعات سے اتنا بلند پایہ نتیجہ استخراج کرنا معمولی دماغ کا کام نہیں ؎

دل شاد کیا روح کو ناشاد کیا — دنیا کے لئے دین کو برباد کیا
امّت نے امام کو مٹا کر گویا — مسجد کو تباہ گھر کو آباد کیا

دوسرا مصرع پہلے مصرع کے مضمون کو واضح کرنے کے لئے ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ مسجد کو تباہ کرکے گھر کو آباد کرنا۔ اس سے زیادہ شقاوت اور کیا ہوگی۔ امام کی نسبت سے مسجد کا ذکر محتاجِ توصیف نہیں ؎

عادی جو نہیں زیادہ خوش ہونے کے — اوقاتِ عزیز وہ نہیں کھونے کے
عاشورہ و عیدین سے ثابت ہی یہ بات — دو دن ہنسنے کے ہیں تو دس رونے کے

دوسرے مصرع میں ردیف بہ معنی فعل مستقبل کتنی شگفتہ ہے۔ ذوق کا یہ مصرع مشہور ہے۔

اگر ہے عید کا اک دن تو عشرہ ہی محرم کا

مگر حق یہ ہے۔ کہ عید کا ایک دن نہیں بلکہ دو ہوتے ہیں۔ جناب احسن نے لفظ عیدین لاکر ہنسنے کے دو دن ارشاد فرماکے یہ قول روزمرہ کے مطابق بھی ہے اور "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے مصداق حال بھی۔

اس مختصر اقتباس سے ظاہر ہے کہ میدانِ تخیّل تنگ تر ہونے کے باوجود احسن مرحوم کی رباعیات کتنی امتیازی حیثیت کی ہیں۔ اور وہ اس صنف پر کتنے قادر ہیں۔ مزید اقتباس کا خیال باعثِ طوالت سمجھ کر کتاب کا دوسرا حصّہ جو سلام کی صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ سلاموں کی تعداد اس مجموعہ میں ۱۶ ہے۔ اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی زمینیں بھی دشوار گزار ہیں۔ مثلاً بلا پسند کرے۔ رضا پسند کرے۔ یا۔ امام سے پہلے۔ سلام سے پہلے۔ یا۔ کفن سے چلا۔ دہن سے چلا وغیرہ۔ ترا وشِ خیال و کاوشِ فکر کا صحیح اندازہ کرنے

کے لئے دونوں قسم کی زمینوں کا کچھ انتخاب یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

دل میں بھری ہوئی ہے مئے الفتِ حسینؑ　　پیتا ہوں جام ساقیِ کوثر کے نام کا
کینہ ہوا تباہ مگر اف نہ کی ذرا　　کیا صبر کیا جگر تھا جنابِ امام کا
حضرت پھرے جدھر کو مڑا ذوالجناح بھی　　ایسا فرس نہیں کوئی سچّا لگام کا

تینوں اشعار صفائی بیان و لطفِ زبان کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ لگام کا قافیہ اس زمین میں آسان نہ تھا۔ مگر ایسی خوبی سے بندھا ہے کہ لطفِ زبان خود داد دینے پر مجبور ہے ؎

صورت یہ بیکسی نے بنائی حسینؑ کی　　گویا نہ تھی خدائی خدا کی حسینؑ کی
دنیا نے کی یہ قدر فزائی حسینؑ کی　　لوٹی ہے کربلا میں کمائی حسینؑ کی

ہر دو مطلع مطلعِ آفتاب ہیں۔ اسلوبِ بیان اتنا دردناک ہے کہ دشمن کا کلیجہ بھی ہل جاتا ہے۔ کوئی لفظ ایسا نہیں۔ جسے تصنّع و آورد میں شامل سمجھا جائے۔ ہمواری بیانی اور بے ساختگی میں اتنا زورِ کلام پیدا کرنا آسان نہیں۔ قدر فزائی میں ہجو ملیح اور کمائی میں لطفِ زبان کے ساتھ ساتھ وسعتِ مفہوم قابلِ غور ہے۔ اس زمین میں تمام اشعار اسی رنگ اور اسی پایہ کے ارشاد ہوئے ہیں۔ مثلاً ؎

بے درد ظالموں نے نہ پوچھا تو کیا ہوا　　میّت ملائکہ نے اٹھائی حسینؑ کی
ہر چند کربلا کا سفر تھا بلائے جاں　　فرقت مگر بہن کو نہ بھائی حسینؑ کی
وقتِ وغا یہ حضرتِ زینب کی تھی دعا　　اللہ خیر ہو مرے بھائی حسینؑ کی

پہلے شعر کا مصرع ثانی بہ لحاظ زورِ کلام کتنا بے پناہ ہے۔ نہ پوچھنے کا ردِّ عمل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ دوسرے شعر کا قافیہ اس لحاظ سے کہ برادر کے معنی ہی رکھتا ہے نورٌ علےٰ نور ہے۔ اس کا لطف الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ بعض فصحا نے مصدر بھانا کو متروک قرار دیا ہے۔ مگر یہ قافیہ علے الاعلان کہہ رہا ہے۔ کہ اس شعر کو اسی مصدر کے ہنرمندانہ استعمال نے یہ شان عطا کی ہے۔ تیسرے شعر میں قافیہ اور ردیف کا باہمی ربط کتنا خوبصورت ہے ؎

کیا پوچھتا ہے کوئی محرّم میں کیا ہوا — گھر کربلا میں ذبح شہ کربلا ہوا
یہ حشر کربلا کی زمیں میں بپا ہوا — بھائی سے بھائی باپ سے بیٹا جدا ہوا

ہر دو مطلع اپنے رنگ میں فرد ہیں۔ کربلا کے ہر دو اجزا (کرا ور بلا) کی تجزی کس جدت سے کی ہے۔ دوسرا مطلع پڑھ کر انیس کا رنگ سخن یاد آتا ہے۔ مصرع ثانی کو پڑھ لینے کے بعد مصرع اوّل میں لفظ حشر کی قیمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے ؎

نہ چھوڑی آن لیکن جان دے دی راہِ مولا میں — اسی کا نام مذہب ہے اسی کا نام ایماں ہے
تپش دیکھو عطش دیکھو پھر اس پر یہ عمل دیکھو — کہ شکوے کے عوض حضرت کے لب پر شکر یزداں ہے

عجیب و غریب ترکیبوں سے شعر کو گورکھ دھندا بنا دینے والے شعرا اس سادئی بیان اور اس زورِ کلام سے درسِ عبرت حاصل کریں ؎

انقلاب آہ زمانے میں ہوا ہے کیسا — تشنہ لب ہیں مئے کوثر کے پلانے والے
ہائے کس درد سے عابد نے کہا اکبر سے — ہم رہے جاتے ہیں او چھوڑ کے جانے والے

کہا نکہتِ زلف اکبر نے رن میں — یہ جنگل ہمارے بسائے ہوئے ہیں
کہا شہ نے اعدا کو چو رنگ کر کے — یہ پشتے ہمارے لگائے ہوئے ہیں

نہ پوچھو حضرتِ شبیرؑ کو صدمے ہوئے کیا کیا — لٹا گھر بھی چھٹا در بھی اٹھا تن بھی گیا سر بھی
ہوئیں سب اک غمِ شبیرؑ سے بے والی و وارث — بہو بھی زوج بھی ہمشیر بھی بھاوج بھی دختر بھی
بلائے کربلا میں مبتلا تھے ساتھ حضرت کے — بھتیجے بھی پسر بھی بھانجے بھی اور برادر بھی

اہلِ ذوق اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مذکورہ بالا اشعار خوش بیانی و طرز بانی کے لحاظ سے کس پائے کے اور اسلامی رنگ میں کتنی فوقیت کے مستحق ہیں۔ حسن بیان کی وہ کون سی خوبی ہے جو ان میں نہیں۔ اگرچہ یہ مختصر انتخاب جناب احسن کی تراوشِ فکر کا صحیح اندازہ

کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ مگر ذرا ان مشکل زمینوں کی سیر بھی کیجئے اور کاوشِ فکر کی کامیابی دیکھئے۔ جن میں مردِ میدان ہی شہسواری کے جوہر دکھا سکتا اور خوش رفتاری کا سکہ بٹھا سکتا ہے

درود بھیج رہا ہوں سلام سے پہلے　　نبی کا نام ہے لب پر امام سے پہلے

پڑھا حسینؑ علیہ السلام سے پہلے　　رضائے حق کا سبق امتِ محمدؐ نے

تمام کی گئی حجت تمام سے پہلے　　وغا کا قصد کیا بعد کو شہِ دین نے

اس زمین کو دیکھئے۔ میدانِ تخیل کی تنگ دامانی کے باوجود ان اشعار کی شان ورفعت کا اندازہ کیجئے۔ مطلع کس شان کا ہے۔ اس کی داد کہاں تک دی جائے۔ انتہا کی چستیٔ بندش۔ بے تکلفانہ آمد۔ بچے تلے الفاظ۔ بولتے ہوئے قوافی۔ ردیف کی نشست۔ کوئی لفظ کسی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا۔ اس مرصع کاری بلکہ نادر کاری کے باوجود حفظِ مراتب کی معنوی خوبی اور درود وسلام کا محلِ صرف ولفظی فرق۔ غرض کس کس چیز کی داد دی جائے۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں قوافی کا حسن اور ردیف کے استعمال کا دوسرا پہلو قابلِ ملاحظہ ہے۔ تیسرے شعر کا مصرع ثانی بالکل الہامی حیثیت کا ہے۔ یہ قافیہ اس زمین میں اجنبی تھا۔ مگر محاورہ کی خوبی کے ساتھ مل کر خود بھی خوب ومرغوب ہو گیا ہے ؎

وہ چھٹ تو لیں طمعِ زر کے دام سے پہلے　　کرینگے اہلِ ہوس قدر کیا قناعت کی

وہ نبح تو لیں مری ضربِ حسام سے پہلے　　اٹھائیں گرز نہ اعدا یہ کہتے تھے شبیرؑ

یہ کی خواص نے بدعت عوام سے پہلے　　ہوئے اصول سے غافل فروع میں الجھے

نہ نکلے جو کبھی بیت الحرام سے پہلے　　حلال ہونے کو وہ کربلا میں جاتے ہیں

سبحان اللہ۔ طبیعت کیا ہے۔ ایک دریا ہے۔ جو اس دشوار گزار زمین میں متواج نظر آتا ہے۔ پہلے اور دوسرے شعر کے مصرع ہائے ثانی ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں۔ دام کس ہنرمندی سے بچھایا گیا ہے۔ ضربِ حسام کس زور کی ہے۔ تیسرے شعر میں اصول وفروع۔ خواص وعوام یہ الفاظ نہیں نگینے ہیں۔ چوتھے شعر میں حرام وحلال کا تقابل بطور صنعت ایہام تضاد کتنا

دل نشین ہے۔ حلال ہونے کو وہ کربلا میں جاتے ہیں۔ اس کے معنوی اشتداد کا کیا ٹھکانا ہے

جو دل کہ مدح شہِ کربلا پسند کرے — کچھ اور بات پھر اس کی بلا پسند کرے

عدوئے عابدِ بیمار تندرست نہ ہو — وہ سم ہو اس کے لئے جو دوا پسند کرے

وہ بوالہوس ہے مہوّس نہیں ہے جو احمق — بجائے خاکِ شفا کیمیا پسند کرے

وہاں تیغ بھی ہے تشنہ کام مثلِ حسینؑ — نہ کیوں وہ خونِ سراشقیا پسند کرے

رفیق و دشمنِ حیدرؑ کے استخواں میں ہے فرق — یہ سگ قبول کرے وہ ہما پسند کرے

مطلع میں کربلا اور بلا کے توافی پر اس وجہ سے کہ کربلا بھی دراصل کرب و بلا ہے شاید کوئی ناواقف معترض ہو۔ مگر حق یہ ہے۔ کہ مصرع ثانی میں لفظ بلا مہند اور مجازی صورت میں ہے حقیقی نہیں ہے۔ اس لئے اسے ایطا نہیں کہا جاسکتا۔ اس مجازی رنگ میں قافیہ کی شگفتگی و برجستگی بلاشبہ قابل داد ہے۔ اس کے علاوہ مصرع ثانی کی روانی و بے تکلفی بھی لائق دید ہے۔ دوسرے شعر میں یہ دعا کہ وہ تندرست نہ ہو۔ بیمار کی نسبت سے کتنی نادر ہے۔ اس جدّتِ بیان کا کیا کہنا۔ تیسرے شعر میں بوالہوس۔ مہوّس۔ خاک۔ کیمیا ان مناسبت الفاظ کا اہتمام ملاحظہ ہو، مہوّس اور بوالہوس کا لطف بھی قابل توجہ ہے۔ چوتھے شعر میں وہاں تیغ کا تشنہ کام ہونا معمولی بات تھی۔ مگر یہ کہنا کہ وہ مثلِ حسینؑ تشنہ کام تھی۔ زور بیان کی انتہا ہے۔ آخری شعر میں ہما کا قافیہ آسان نہ تھا۔ مگر تلاشِ مضمون کی کامیابی دیکھئے۔ اور اس مضمون کے ساتھ اس قافیہ کا ربط ملاحظہ کیجئے۔

دو سلام ایسے بھی ہیں۔ جو مسلسل ہیں۔ دو تین شعر کا قطعہ تو غزل یا سلام میں بیشتر پایا جاتا ہے۔ مگر پوری غزل یا سلام کو ردیف و قافیہ کا التزام مسلسل کہنے میں بہت مانع ہوتا ہے۔ جناب احسن کے دونوں سلام ان مشکلات کے باوجود بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک سلام تو ایسا ہے۔ جس میں تعداد اشعار تیس سے بھی زیادہ ہے۔ اتنی تعداد میں مسلسل

اشعار ہم قافیہ و ہم ردیف رکھ کر کہنا معمولی بات نہیں ۔

تیسرے حصہ میں متعدد خمسے زینت اشاعت کئے گئے ہیں۔ حضرت داغ مرحوم کے ایک سلام کی تخمیس کے بعض بند ملاحظہ ہوں۔ سلام کا ایک مطلع یہ تھا ؎

رن میں جب پہنچے نہ تا آلِ پیمبر پانی　　　عرقِ شرم میں کیونکر نہ رہے تر پانی

پانی کی ردیف کو جتنا ربط سلام سے ہو سکتا ہے۔ غزل سے نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس ردیف میں شعرا نے جو غزلیات کہی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اسی ردیف کے سلام اعجازِ کلام کے لحاظ سے زیادہ زوردار بلکہ معرکۃ الآرا ہیں۔ اسی ردیف میں حضرتِ جلیل مانکپوری کا سلام جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہائے شبیرؑ نہ پائیں لب دریا پانی　　　بات ایسی ہے کہ ہوتا ہے کلیجا پانی

بلاشبہ اردو شاعری کا سرمایۂ فخر و مباہات ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ موصوف اسی زمین میں اگر غزل فرماتے تو وہ اس دھوم کی ہرگز نہ ہو سکتی۔ جناب داغ کا مطلع مذکورۃ الصدر معنی آفرینی اور نزاکت خیال کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے۔ اب اس کی تخمیس بھی ملاحظہ ہو ؎

سختیاں دیکھ سکے ہائے یہ کیونکر پانی　　　اک بشر بند کرے ایک بشر پر پانی

آبرودار ہے ہرگز نہیں پتھر پانی　　　رن میں جب پہنچے نہ تا آلِ پیمبر پانی

عرق شرم میں کیونکر نہ رہے تر پانی

اللہ اللہ۔ کس قیامت کے مصرعے لگائے ہیں۔ کوئی مصرع ایسا نہیں جو اپنی شان میں دوسرے کا مدمقابل نہ ہو۔ حسنِ سخن کے کرشمے ہر مصرع میں دامنِ دل کو کھینچ کر کہتے ہیں کہ جا اینجاست۔ اصل شعر سے جو ربط پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا کیا کہنا۔ تخمیس میں یہی نکتہ سب سے زیادہ قابل لحاظ ہوتا ہے' عرقِ شرم میں تر رہنے کی جو وجہ حضرت داغ نے ارشاد فرمائی۔ اس کی تائید میں یہ کہنا کہ پانی آبرودار ہے۔ پتھر تو نہیں۔ کہ اس پر اس جبر و تشدد کا اثر نہ ہو۔ ربطِ کلام کی انتہا ہے ؎

بولی تقدیر پلاؤ گے کیسے لے جا کر　　چلے عباسؑ جو مشکیزے میں بھر کر پانی

اس شعر کی تخمیس بھی ملحوظ ہو ؎

خشک لب دیکھ کے معصوموں کے بادیدۂ تر　　مشک لے کر اٹھے عباس گئے دریا پر
پانی بھرنے سے جو فارغ ہوئے وہ نام آور　　بولی تقدیر پلاؤ گے کیسے لے جا کر
چلے عباس جو مشکیزے میں بھر کر پانی

ہر دو مصرعوں کی تنگ دامانی کی وجہ سے روایت کے بیان میں جو کمی رہ گئی تھی۔ جناب احسن نے اس کمی کو ایسی ہنرمندی سے پورا کیا ہے۔ کہ اصل شعر کو بالکل چھین لیا ہے۔ بولی تقدیر۔ ان الفاظ کے ساتھ تیسرے مصرع کو جو ربط ہے۔ اس کی تعریف محتاج بیان نہیں۔ لب خشک و دیدۂ تر کا تقابل بھی قابل دید ہے ؎

شاہ کی تشنہ بہی یاد جو آئی اُس وقت　　پھینکا عباسؑ نے چلّو میں اٹھا کر پانی

اس شعر کو اپنانے کی خوبی ملاحظہ ہو ؎

مشک عباسؑ نے بھر کر جو اٹھائی اس وقت　　شکل انہیں یاس نے حسرت کی دکھائی اس وقت
اور تو بات ہر اک دل سے بھلائی اُس وقت　　شاہ کی تشنہ لبی یاد جو آئی اس وقت
پھینکا عباسؑ نے چلّو میں اٹھا کر پانی

اس زمین میں ایک تو قوافی کو ایطا سے بچانا لازم تھا۔ دوسرے ردیف کا انحصار بھی محال تھا۔ ان مزید پابندیوں کے باوجود تینوں مصرعے بہت ہی رواں اور ہموار کہے ہیں۔ تخمیس میں تیسرا مصرع سب سے زیادہ قابل توجہ ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ اصل شعر سے ربط پیدا کرنیکا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے۔ یہ مصرع اس بند میں بالکل بے ساختہ نظر آتا ہے۔ ربطِ کلام کے لحاظ سے یہ بند بھی مرصّع ہے ؎

آبرو خاک ہو دنیا میں تری نہر فرات　　آل احمدؐ کو دیا تو نے نہ بڑھ کر پانی

تخمسے عموماً مشاہیر کے کلام پر کہے جاتے ہیں۔ اور اس کام کے لئے مشاہیر کی صرف وہ چیزیں

انتخاب کی جاتی ہیں۔ جو ان کے سرمایۂ سخن میں بہترین اور گراں قدر ہوں۔ اس قسم کے کلام کا ہم پلہ کلام کہنا اور ان نامور شہبازوں کی پرواز تک پہنچنا معمولی طبیعت کا کام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس شعر کی تخمیس سبحان اللہ۔ کتنی نورٌ علےٰ نور ہے ؎

دیکھ کر تشنہ دہانیٔ شہ نیک صفات　　قدم اپنے نہ بڑھائے گئے تجھ سے ہیہات
تو نے مٹی میں ملا دی ہے خود اپنی اوقات　　آبرو خاک ہو دنیا میں تری نہر فرات
آلِ احمدؐ کو دیا تو نے نہ بڑھکر پانی

آلِ احمدؐ کے تعلق سے مصرع اوّل اور بڑھ کر کے تعلق سے مصرع ثانی کتنا مربوط ہے۔ تیسرے مصرع میں محاورہ کا جو لطف ہے، اس کی وجہ سے اس کی خوبی وجدانی ہے۔ یہ مصرع بالکل الہامی کہنا چاہئے۔ بیان کی یہ صفائی۔ زبان کی یہ حلاوت اور اصل شعر کے الفاظ سے اتنا ربط۔ غرض کس کس چیز کی داد دی جائے۔

اس تخمیس کے بعد حضرت داؔغ کی دو غزلیات پر خمسے شاملِ اشاعت ہیں۔ یہ دونوں خمسے اس کتاب میں بلاشبہ جناب احسن مرحوم کے شاہکار اور نوادرِ افکار میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ سلام پر خمسہ کچھ اور بات ہے۔ اور غزل پر سلامی رنگ کا خمسہ کچھ اور چیز ہے۔ غزل کے مضامین کو سلام کے سانچے میں ڈھالنا اور اس کے اشعار کو واقعات کربلا سے ربط دینا فی الواقع نہایت دشوار ہے۔ جو چابک رفتار اس منزل کو کامیابی سے طے کر سکتا ہو۔ اس کی ہنرمندی اور شاعرانہ کمال سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جناب احسن نے اس اظہارِ ہنرمندی کے لئے غزل بھی وہ منتخب کی ہے۔ جس میں سلامی رنگ کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

لذتِ سیر دگر چشم تمنا لے گی　　ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لیگی

اگرچہ اس غزل کے بعض اشعار سلامی رنگ میں کسی طرح نہ آسکنے کی وجہ سے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مشہور شعر اس مخمس میں شامل نہیں ؎

چین سے آپ رہیں کچھ مری پروا نہ کریں   کیا شب ہجر بلا ہے کہ مجھے کھا لے گی

مگر انصاف یہ ہے۔ کہ ایسے اشعار علیحدہ کر دینے کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ اس قسم کی زمین ہو اور پھر اشعار غزل کے ہوں اور غزل بھی حضرت داغؔ کی ہو۔ جس میں عاشقانہ نوک جھونک اور معاملہ بندی کے مضامین کی فراوانی لازمی امر ہے۔ پھر بھی آٹھ اشعار سلامی رنگ کی تخمیس میں منسلک ہو جائیں۔ یہ کوئی معمولی مشاق کا کام نہیں۔ ان مشکلات اور اس فہم کو صحیح طور سے وہی سمجھ سکتا ہے، جو اس مصیبت میں مبتلا ہونے کی نادانی کا مرتکب ہو چکا ہو۔ اب اس غزل کے مطلع مذکورہ بالا کی تخمیس پیش کی جاتی ہے ؎

ہمتِ صبرِ حسینؑ آج نہ بدلا لے گی   بلکہ میعادِ عوض اور بھی بڑھوا لے گی
ہاں مگر حشر میں جب خلقِ خدا آئے گی   لذتِ سیرِ دگر چشمِ تمنا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لیگی

جناب داغؔ آج زندہ ہوتے۔ تو اس مطلع کی اس تخمیس پر جس میں غزل کی دنیا ہی تبدیل کر دی گئی ہے۔ صد مرحبا کہتے۔ تسلسل کلام کے لحاظ سے اب یہ پانچوں مصرعے ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں اور جوڑ کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ معنوی لحاظ سے مطلع کے مفہوم میں جو انقلاب آ گیا ہے۔ اس پر تمام اہلِ ذوق و سخن شناس انگشت بدنداں ہوں گے ؎

شکوۂ دہر نہ بیدادِ فلک کی فریاد   حشر میں خلقِ خدا نام تمہارا لے گی

تخمیس ملحوظ ہو ؎

سبطِ احمدؐ کے معاند تھے بڑے زشت نہاد   ان کے اغوا ہی سے پھیلا تھا یہ سب شور و فساد
ظالموں سے کوئی کہدے کہ یہ تم کو رہے یاد   شکوۂ دہر نہ بیدادِ فلک کی فریاد
حشر میں خلقِ خدا نام تمہارا لیگی

حضرت داغؔ نے صرف ایک ظالم کو مخاطب کیا تھا۔ جناب احسن نے بہت سے ظالموں کو مخاطب کیا ہے۔ مفہوم میں صرف اتنا فرق قائم کر کے شعر کو کس آسانی سے اپنے رنگ میں لے آئے

ہیں۔ یہ تم کو رہے یاد۔ اس ٹکڑے نے مصرع ثالث میں جو زور پیدا کیا ہے۔ وہ محتاجِ بیان نہیں ؎

خاص بخشو گے تمہیں اپنے گنہگاروں کو	بخشش عام نہ ان کا کبھی ٹھیکا لے گی

اس زمین میں یہ قافیہ حضرت داغؔ ہی کا حصہ تھا۔ تخمیس میں جناب احسنؔ نے کس صفائی سے یہ قافیہ چھینا ہے ؎

کیا بھروسا شہ کونین پہ تھا یاروں کو	یہی کہتے سنا حضرت کے وفاداروں کو
پوچھتا اور کہاں ہے کوئی غمخواروں کو	خاص بخشو گے تمہیں اپنے گنہگاروں کو
بخشش عام نہ ان کا کبھی ٹھیکا لیگی

اصل شعر میں خدا کی رحمتِ خاص پر بھروسا کیا گیا تھا۔ مصنف نے اس اعتماد کو شہِ کونین کی طرف منتقل و منسوب فرماکر تخمیس کی مشکل کس آسانی سے حل کرلی ؎

کام بگڑا نہ بنائے سے بنے گا ہرگز	میری تدبیر نہ تقدیر سے بدلا لیگی

اس شعر کی تخمیس حسب ذیل ہے ؎

شاہ کہتے تھے نہ گھبرائے گا بندہ ہرگز	چھوڑے گا شیوہ نہ تسلیم ورضا کا ہرگز
حکم جو حق کا ہے وہ ٹل نہیں سکتا ہرگز	کام بگڑا نہ بنائے سے بنے گا ہرگز
میری تدبیر نہ تقدیر سے بدلا لیگی

جناب احسنؔ یہاں بھی حضرت شبیرؑ کے میدانِ کربلا کی طرف سفر کرنے کے عزم کو اپنے مصرعوں کی شانِ نزول قرار دے کر غزل کے شعر کو کس صفائی اور سہولت سے سلامی رنگ میں لے آئے ہیں۔ ہر ایک بند میں یہی ہنرمندی مقدم ہوکر سامنے آتی ہے۔ اور چشم تماشا اس کمال پر اتنی محو حیرت ہو جاتی ہے۔ کہ بند کی دوسری خوبیوں پر توجہ بھی مبذول نہیں ہوتی۔

حضرت داغؔ کی دوسری غزل کا مطلع یہ ہے ؎

سوز و گدازِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں	مانندِ آبلہ ہمہ تن آب دیدہ ہوں

ایک تو مطلع اتنا لاجواب۔ دوسرے اس میں صاف طور سے عشق کا مضمون۔ اسے سلامی رنگ میں لانے کی مشکل اہل ہنر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مگر دیکھئے کس خوبی سے یہ مشکل حل کی گئی ہے

فرماتے تھے حسینؑ کہ آفت رسیدہ ہوں — جب سے حسنؑ شہید ہوئے ہیں جریدہ ہوں
پوچھے نہ کوئی مجھ سے کہ میں کیوں کبیدہ ہوں — سوز و گداز عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانندِ آبلہ ہمہ تن آب دیدہ ہوں

سبحان اللہ۔ یہ تخمیس نہیں ہے۔ سحر بیانی ہے یا اعجاز کلام۔ قوافی کی چستی اور نشست کا کیا کہنا۔ تینوں مصرعوں کی روانی بھی اس بند میں دیکھنے کی چیز ہے۔ فرماتے تھے۔ اس تعظیمی لفظ کی گنجائش بھی نکل آئی۔ پانچوں مصرعوں کا باہمی ربط بلکہ دست و گریباں ہونا کس قدر حیرت انگیز ہے ؎

اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ — میں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں

غزل میں یہ شعر پڑھ کر کس کو یہ خیال آسکتا ہے۔ کہ غزل گوئی کا یہ مخصوص انداز سلامی تخمیس کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ لفظ چھیڑ چھاڑ اس صلاحیت میں اور بھی مخل ہے۔ مگر ملاحظہ ہو تخمیس کس ہنرمندی سے کی گئی ہے ؎

ایامِ ہجر حضرتِ صغراؑ کو تھے پہاڑ — ہوتی جو دل میں حسرت و ارماں کی بھیڑ بھاڑ
دل تھا مگر یہ کہتی تھیں کھا کھا کے وہ پچھاڑ — اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں

پانچویں مصرع کے الفاظ تذکر و تانیث دونوں پر حاوی تھے۔ مصرع کی زبان کے اس پہلو نے جناب احسنؔ کو پوری امداد دی ہے۔ قوافی میں محاورۂ زبان کا لطف ہر جگہ موجود ہے۔ دل تھا۔ یہ ٹکڑا کس بلا کا ہے۔

اسی تخمیس کا ایک بند اور ملاحظہ ہو ؎

سر کاٹ کر حسینؑ کا جب لے چلے عدو — وہ سر تلاشِ جسم میں پھرتا تھا کو بکو

کرتا تھا حکمِ حق سے یہ برجستہ گفتگو　　افتادگی پہ بھی نہ گئی اُس کی جستجو

گویا زمین پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

جو لوگ حضرت فصیح الملک مرحوم کی شاعری کو بازاری باتیں کہا کرتے ہیں۔ یہ شعر ان کا منہ بند کرنے کو کافی ہے۔ جناب احسن نے کس خوبی سے اسے واقعاتِ کربلا سے مربوط کیا ہے۔ مُرغِ پریدہ کی تفسیر اس سے بہتر اور کیا ہوگی۔ سایہ۔ افتادگی۔ جستجو۔ زمین۔ ان تمام الفاظ کا اس تخمیس میں پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ تیسرے مصرع کے الفاظ حکمِ حق اور برجستہ کتنے ضروری ہیں۔ معنوی ربط کے لحاظ سے ایک ایک لفظ بیان کردہ واقعات کا جزو لاینفک ہے۔

اس قسم کا بہت سا انتخاب پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر طوالتِ کلام کے خیال سے مختلف مقامات کے دو تین بند اور یہاں نقل کر دیئے جاتے ہیں۔ اہل ذوق خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ سلامی میدان میں جناب احسن کا پایۂ کلام کس امتیازی حیثیت کا اور کس کمال تک پہنچا ہوا ہے ؎

شریر فوجِ مخالف میں جمع تھے جتنے　　وہ خود نہ گن سکے ظلم و ستم کئے اتنے

نہ پوچھئے کہ ہوئے حشر رونما کتنے　　فسوں گروں نے اٹھائے ہزارہا فتنے

حسینؑ نے لبِ معجز بیاں سے کچھ نہ کہا

وہ بادشاہِ دو عالم وہ خلق کے سردار　　بشر تو تھے مگر ایسے ملک ہوں جن پہ نثار

مدد کسی کی خدا کے سوا نہ تھی درکار　　اُٹھائے رنج مگر با وجودِ حالتِ زار

جہاں پناہ نے اہلِ جہاں سے کچھ نہ کہا

امامِ وقت کا فیضِ ہدایت تھا گراں مایا　　ہُما پایہ ہوا وہ جس پہ ان کا پڑ گیا سایا

مگر اعدا کی بدبختی نے ایسا انکو تھپکا یا　　نہ چونکے حضرتِ شبیرؑ نے ہر چند چونکایا

عجب سوتی ہوئی تقدیر تھی غفلت شعاروں کی

اسیرانِ وفا اہلِ جفا کے ظلم سہتے ہیں مگر وہ آہ کرتے ہیں نہ آنسو اُن کے بہتے ہیں
اِنہیں کے واسطے الفاظِ قرآنی یہ کہتے ہیں شہیدانِ رہ حق قتل ہو کر زندہ رہتے ہیں

کفن کی ان کو پروا ہے نہ حاجت ہے مزاروں کی

عذوبتِ بیان اور حلاوت زبان کے لحاظ سے چاروں بند فصاحت کی جان اور بلاغت کا ایمان ہیں۔ پہلا اور چوتھا بند اتنے تنگ اور اتنے محدود قوافی ہیں کہ پانچواں قافیہ ملتا ہی نہیں۔ کتنے برجستہ اور شگفتہ ہیں۔ دوسرے بند میں اہل جہاں کی نسبت سے جہاں پناہ کتنا قیمتی لفظ ہے۔ تیسرا بند بھی روانی اور بیان کی بے تکلفی کے لحاظ سے اسی پائے کا ہے کسی بند میں کوئی مصرع ایسا نہیں۔ جو ضعفِ بیان کی وجہ سے اپنے رفیقوں کے سامنے شرمندۂ وجود ہو۔ آخری بند میں سہل ممتنع کا رنگ کتنا دلکش ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ جناب احسن مرحوم کا یہ مجموعۂ کلام خواہ وہ رباعی کی صورت میں ہے یا سلام اور تخمیس کی شکل میں۔ ان کی استادانہ شان کا آئینہ اور ان کی گوہر فشانیوں کا گنجینہ ہے۔ محاسنِ کلام کا نمایاں پہلو یہ ہے۔ کہ حضرت داغ کا انداز بیان قدم قدم پر اپنی جھلک دکھا رہا ہے زبان کی شستگی۔ بیان کی اصابت اور پختگی۔ ڈھلے ہوئے مصرعے۔ بجے تلے الفاظ اور ان کا برمحل استعمال بیان کی صفائی اور بے تکلفی۔ شعر پڑھا اور دل میں اترا۔ غرض نکاتِ فن اور حسنِ سخن کے لحاظ سے مرحوم کی معجز بیانی ہر سخن شناس و نکتہ سنج سے خراجِ تحسین لئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ نوادرِ افکار جو کارنامۂ عمر کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں۔ بلاشبہ اس قابل ہیں۔ کہ انہیں گنجِ گراں مایہ کہا جائے اور مرحوم کے قابل فرزندان سے اپنے نامور باپ کا بیش بہا

اثاثہ خیال کریں ۔

اگرچہ مرحوم کے جوش عقیدت کو اس حسنِ تکلم اور جوشِ بیان سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا
مگر عطوفی آبر احسنی نے غلط یا صحیح خیال سے ان دونوں عناصر کو علیحدہ رکھنا ہی مناسب اور مصلحتِ
وقت سمجھ کر اس کتاب کا نقد و تبصرہ راقم الحروف کے سپرد کیا۔ تاکہ بحث صرف حسنِ سخن تک
محدود رہے ۔ اور جوشِ عقیدت کی ہم نوائی اس تبصرہ میں شاملِ حال نہ ہو سکے۔ مگر حق یہ ہے
کہ دل سے نکلی ہوئی آواز اسی جوشِ عقیدت کے زور سے زبان پر آئی ہے۔ اس کے بعد وہ حسنِ
سخن کے پَر لگا کر فضائے ادب میں پھیلی ہے۔ گرمیِ کلام جوان نوادرِ افکار میں نمایاں ہے۔ وہ
ان دونوں عناصر کی کیمیائی ترکیب کا نتیجہ ہے ۔ فقط ۔

قطعۂ تاریخ وفات جناب احسنؔ مارہروی مرحوم

از جناب جوشؔ ملسیانی صاحب "مدیر" رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور۔

مرگِ احسنؔ کی دل خراش خبر — جس نے سن لی وہ ہو گیا بے چین
آہ کیسی چلی یہ بادِ خزاں — ہر گلستاں میں ہے صبا بے چین
سرد آہیں ہیں گرم نالے ہیں — ہوئے مرغانِ خوش نوا بے چین
شاعری پیکرِ ملال ہے آج — شعر بے تاب قافیہ بے چین
یہ وہ درد آشنا تھے جن کا بیان — اک زمانے کو کر گیا بے چین
اثرِ گرمیِ سخن سے رہی — حُسنِ معنی کی ہر ادا بے چین
شعر میں لفظ ہل نہیں سکتا — چُست بندش سے ہو گیا بے چین
اپنی وسعت سے ان کا ہر مضمون — قفسِ شعر میں رہا بے چین
ان کے ہر اک بیان میں دیکھا — شامِ فرقت کا ماجرا بے چین
ان کے ہر ایک شعر میں پایا — عشق و الفت کا مدعا بے چین
انتہا یہ کہ صبر کا مضمون — نظر آیا ہمیں بڑا بے چین
گوشِ معنی شنو کی فرقت میں — سازِ الفت کی ہے صدا بے چین

سالِ ہجری رقم کرو اے جوشؔ
غمِ احسنؔ نے دل کیا بے چین
۱۳۵۹ھ

نوحۂ احسنؒ

از عروج زیدی، بدایونی

احسنِ مارہروی! ملکِ ادب کے شہریار! — کج تھی فرقِ شعر پر تجھ سے کلاہِ افتخار
خون تیرا شجرہ گیرِ دودمانِ مصطفےٰ — قلب تیرا آخری پیغامِ حق سے مالدار
تیری استعدادِ علمی کا زمانہ معترف — تیرا لوہا مانتے ہیں نکتہ دانِ روزگار
تیری ہر کوشش ترقئ زباں میں کامیاب — اے دبستانِ علی گڑھ کے موقر لکچرار!
تیرا ہر شاگرد اپنی جگہ اک استادِ فن — ذرہ ذرہ خاکِ دامنگیر کا گردوں وقار
بعد تیرے اب فصاحت کا مربی کون ہے؟ — اے فصیح الملک کی اعجاز پرور یادگار
نادرِ بے مثل تھا تو شاعرِ شیریں مقال — تیری تصنیفات ہیں علم و ادب کے شاہکار
صحتِ شعر و سخن نازاں تری اصلاح پر — تیری تنقیدوں سے لرزاں شاعرانِ نامدار
تیرا اخلاقِ حمیدہ میرے دل پر نقش ہے — وہ بزرگانہ نوازش وہ خلوص آمیز پیار
تذکرہ جس کا پڑھا میں نے خطوں میں بارہا — ہائے وہ چھوڑا تھا تیری موت کا اک اشتہار
ہائے اب کس کو لکھوں نقادِ فنِ فخرِ ادب — کون ہے تجھ سا وحیدِ عصر و فخرِ روزگار
ہر جگہ تیرے پرستار و عقیدت مند ہیں — ایک مارہرہ ہی کیا ہندوستاں ہے سوگوار
تیری خدماتِ جلیلہ کی ضرورت تھی ابھی — اُس زباں کو جس کے حامی چند ہیں دشمن ہزار

انقلابِ دہر رنگ اپنا جما سکتا نہیں
کوئی اُردو داں تجھے دل سے بھلا سکتا نہیں

اصلاحاتِ احسن

(سید ظہیر الدین احمد علوی ایم۔ اے۔ ال ال۔ بی لکچرار
شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حضرت احسن مارہروی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اردو ادب میں ایسی مایۂ ناز ہستیاں اتنی کم ہیں کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں لیکن پھر بھی فلک کج رفتار نے انہیں ہم سے چھین ہی لیا۔ ان سے میری شناسائی ایک عرصہ دراز سے تھی اور مرحوم مجھے اپنے بیٹے یا چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے تھے۔ میں نے ایسے خطوط مرحوم کے پاس متعدد دیکھے جن میں کسی نکتہ یا مسئلہ مختلف فیہ کے متعلق ہندوستان کے طول دارض سے صحتِ لفظ یا صحت محاورہ وغیرہ کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق دریافت کیا گیا ہو اور مرحوم کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوا کرتا تھا۔ اسی ایک بات سے مرحوم کی ادبی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کا انتقال اردو ادب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

حضرت احسن مارہروی علاوہ ایک بہترین ناقد ونثار ہونے کے ایک اعلیٰ پایہ شاعر بھی تھے چنانچہ ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع ہے۔ دیگر اہالیان قلم نے مولانا مرحوم کے صفات پر مختلف نوع سے روشنی ڈالی ہے میں ایک خاص واقعہ جس سے بجز میرے کسی کو واقفیت نہیں ہے پیش کرتا ہوں جس سے مولانا مرحوم کی استعداد شعری پر روشنی پڑے گی۔ مین پوری کے قیام میں مجھ سے جناب مائل مین پوری سے ملاقات ہوئی جن کا تعارف یہ ہے۔ منشی دیبی پرشاد نام، مائل تخلص، مین پوری کے قدیم باشندے نجیب الطرفین سکسینہ کایستہ اور منشی جانکی پرشاد صاحب آنجہانی کے خلف الرشید تھے آپ نے مکتبوں اور چند روز تحصیلی مدرسہ (مین پوری) میں علوم رسمیہ کی تحصیل کی تھی۔ باسواد، خوش مذاق، خوشخط، خوش اخلاق بزرگ، اور پرانی صحبتوں اور بزرگانِ قدیم کے خلوص ومحبت کی زندہ یادگار تھے۔ آپ کے خاندان کا آبائی

پیشہ زمینداری و وکالت تھا۔ اپنے آزادہ مزاجی وخوش باشی کے سبب سے آپ نے وکالت کی الجھنوں کو پسند نہ کیا اور بزرگوں کی متروکہ ملکیت وزمینداری کی آمدنی پر قانع رہے اور چشم بددور بفراغت تمام زندگی بسر کی۔ فارغ البالی اور اطمینان وہ نعمتیں ہیں جو دنیائے شعروسخن کے ساکنین کے ہاتھ بہت ہی کم آتی ہیں۔ مائل صاحب ان سے بہرہ اندوز ہونیکی حیثیت سے ماشاء اللہ دنیا کے خاص خوش قسمت شعراء کے زمرے میں داخل تھے۔

مائل صاحب کو اوائل عمر ہی میں شعروشاعری کا چسکا پڑ گیا تھا اور آپ نے بیس سال کی عمر سے "عاصی" تخلص کرکے شاعری شروع کر دی تھی اور اس کوچہ میں قدم رکھتے ہی آپکو اپنی اصلاح وتربیت کی فکر دامنگیر تھی اور بھی مادّہ صلاحیت پذیری تھا جس نے انھیں آگے چلکر ارباب کمال واصحاب ہنر کی مؤخر فہرست میں شامل کر دیا۔ آپ نے شروع شروع میں احسن صاحب کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے "آں خویشتن گم است کرا رہبری کند" میں خود اصلاح استاد داغ سے لیتا ہوں اصلاح کروں گا کیا، اگر آپ کو اصلاح مطلوب ہے تو حضرت استاد کی طرف رجوع کیجئے" کہا اور آپ کی غزل داغ مرحوم کی خدمت میں بھیجدی اس طرح آپ نواب داغ مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔

مائل صاحب کے کلام میں شروع ہی سے پختگی کے آثار نمایاں تھے۔ جب ہی تو داغ مرحوم نے ایک بار ان کا ذکر کرتے ہوئے حضرت احسن مارہروی سے دریافت کیا "کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟" احسن صاحب نے جواب دیا "جی ہاں" حضرت داغ نے فرمایا "کوئی معمر آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔ "احسن صاحب نے عرض کیا" نہیں جناب وہ ایک نوجوان آدمی ہیں"۔ اس واقعہ کے بعد نواب صاحب مرحوم نے مائل صاحب کو لکھا "کیا تم نے بڈھوں کا سا تخلص اختیار کیا ہے۔ تخلص تبدیل کرو" اور ان کی خواہش پر "مائل" تجویز فرمایا۔ گویا آپ کا تخلص عطیہ سرکار نواب فصیح الملک بہادر مرحوم ہے۔ مائل صاحب نے پہلی غزل ۱۸۹۲ء میں اصلاح کے لئے نواب داغ مرحوم کی خدمت میں بھیجی تھی اور اس وقت سے ۱۹۰۵ء تک کہ اسی سنہ

میں آپ کا دیوان شائع ہوا تیرہ[۱۳] سال تک برابر اصلاح لیتے رہے۔ حضرت داغ نے آپکو ہمیشہ سلیس سادہ اور روزمرّہ لکھنے کی تاکید و تلقین کی اور آپ نے مرحوم کی ہدایات پر برابر عمل کیا یہی وجہ ہے کہ مرحوم کے حلقہ کی خصوصیاتِ شاعری آپ کے کلام میں بہت کچھ موجود ہیں۔ مثلاً

آپکا آنا مرے گھر آج کیونکر ہو گیا — کیا مقدر غیر کا میرا مقدر ہو گیا

اب یہ ہے کس کے گلے کا ہار دست نازنیں — تم تو کہتے تھے عدو کے دم میں آسکتے نہیں

فراق یار میں کہتی ہے بیکسی مجھ سے — کہ دم ترا بھی غنیمت ہے دردمندوں میں

کل چاٹ لیا حضرت واعظ نے مرا مغز — میری تو ہے ان قبلۂ حاجات سے توبہ

کرے خاک کوئی بہروسہ تمہارا — قیامت کا وعدہ ہے وعدہ تمہارا

ذرا دم لے لو، ٹھیرو بات سُن لو — کہاں جاتے ہو آئے ہو کہاں سے

مر کر بھی تو زاہد کو خدا مل نہیں سکتا
جنّت جسے کہتے ہیں وہ حوروں کا مکاں ہے

بعض بعض اشعار داغ صاحب کے عام رنگ سے الگ اور دیگر شعرائے دہلی کے رنگ میں ہیں مثلاً۔

مرے گناہ چھپے تھے مری رعونت میں — بڑی تلاش سے پکڑے گئے قیامت میں

جو محو ہو کے رہیں ہم تری حقیقت میں — تو ایک اور لطافت ملے لطافت میں

حضرت مائلؔ، صاحب دیوان ہونے کے علاوہ جو اندازاً دو ہزار اشعار پر حاوی اور مطبوعہ ہے۔ دو قابل قدر کتابوں کے مؤلف بھی ہیں۔

(۱) منظوم ترجمہ "شریمد بھاگوت گیتا" فلسفۂ ہنود کی بیمثل سنسکرت کتاب کا ترجمہ کر کے آپ نے "اردو ادب" میں ایک قابل قدر و تحسین اضافہ کیا ہے اور اس کے مطالعہ سے انکی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی ہے۔

(۲) بھارت کی شہرہ آفاق رزمیہ نظم "رامائن" کو بھی آپ نے اردو مثنوی کا جامہ پہنایا ہے۔

ایسی ہستی اور یہ گمنامی کہ کوئی جانتا بھی نہیں۔ انہوں نے مجھے سیکڑوں خطوط دکھائے جو استاد کی خدمت میں بھیجے تھے اور جن میں غزلیں بغرض اصلاح تھیں اور ان میں اصلاحیں سرخ روشنائی سے کی گئی تھیں۔ مائل صاحب ان خطوط کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور انھیں باقاعدہ ایک مخمل کے جزدان میں پیچ کر رکھا کرتے تھے اور اپنے مخصوص احبّہ کو دکھا بھی دیا کرتے تھے۔ ایک بار مجھے معلوم ہوا کہ کثرت بارش سے ان کا گھر گر گیا میں دریافت حال کے لئے گیا تو دیکھا کہ رو رہے ہیں اور فرماتے ہیں" مجھے مال و اسباب یا روپئے پیسے کا غم نہیں ہے بلکہ استاد کا سرمایۂ اصلاح بھی اسی ڈھیر میں مدفون ہے۔" دوسرے دن پھر گیا تو دیکھا کہ چند خطوط جو نم ہو گئے تھے انہیں سکھا رہے تھے اور باوجودیکہ بہت سامان ضائع ہو گیا تھا لیکن اس جزدان کے مل جانے سے بیحد مسرور تھے۔ یہ تھی استاد کی قدر۔

اس کے بعد میں علی گڑھ آ گیا اور یہاں حضرت احسن مرحوم سے زیادہ قربت حاصل ہوئی، احسن صاحب کی تحریرات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ احسن صاحب کی تحریر ان اصلاحات سے بالکل ملتی تھی جو جناب مائل کی غزلیات پر کی گئی تھیں۔ مجھے شبہ ہوا اور میں نے مولانا احسن سے استفسار کیا کہ" جناب مائل مین پوروی سے آپ واقف ہیں" انہوں نے کہا" خوب" میں نے کہا کہ" وہ اصلاحیں جو ان کی غزلیات پر حیدرآباد سے ہو کر آیا کرتی تھیں۔ میں نے دیکھی ہیں وہ آپ کے قلم کی معلوم ہوتی ہیں" اس پر مولانا خاموش رہے اور کہا کہ" میں اُن ایام میں استاد کے ہمراہ حیدرآباد میں تھا" میں نے پھر دریافت کیا کہ وہ اصلاحیں آپ کی ہیں یا استاد داغ کی فرمایا" اس مسئلہ کو یوں ہی رہنے دو" میں نے پھر اصرار نہ کیا۔ اب میں ان میں سے چند اصلاحیں پیش کرتا ہوں۔ شعر مائل سے

ذرا میخانہ میں آکر کوئی یہ دل لگی دیکھے   نشے میں شیخ جی کو (خیال) آیا دین و ایمان کا

اصلاح   "   " (دھیان) "

"خیال" بروزن "ملال" ہے۔

توضیحات:۔ عروضی سقم رفع ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاح سے شعر میں سلاست بڑھ گئی اور زور پیدا ہو گیا۔ علاوہ ازیں "خیال" خصوصیت کے ساتھ عالم ہوش وحواس کی چیز ہے اور شاعر "شیخ جی" کا کیرکٹر عالم سرور میں دکھانا چاہتا تھا جس میں حواس باقی نہیں رہتے اس لئے یہ بھی لفظ منشاء شاعر کے خلاف تھا اور لفظی خرابی کے دوش بدوش شعر کی معنویت میں فرق آیا جاتا تھا۔

شعر مائل طبیبو! مان لو کہنا، میں اچھا ہو نہیں سکتا مریض (ہجر) ہوں میرا مداوا ہو نہیں سکتا

اصلاح " " " " " (عشق) "

توضیحات:۔ ہجر سے عالم عشق کی صرف ایک کیفیت نمایاں ہوتی تھی اور شعر میں خصوصیت پیدا ہو گئی تھی اصلاح نے مکمل دنیائے عشق ومحبت کو بھر دیا اور شعر بہت بلند اور وسیع ہو گیا۔

شعر مائل (عدم کی ہم) نہیں کہتے جو ہو جائے تو ہو جائے یہاں تو فیصلہ اُن کا ہمارا ہو نہیں سکتا

اصلاح (قیامت کی) " "

توضیحات:۔ "عدم" نیستی اور عالم ثانی کے معنی میں آتا ہے۔ گو مجازاً اس کا اطلاق یوم الحساب پر ہو سکتا ہے مگر استعمال نہیں کیا جاتا اس لئے شعر لغت ومحاورہ کی غلطی کا حامل تھا۔ علاوہ ازیں ضمیر متکلم (ہم) کی موجودگی بھی ذرا مذاق سلیم کو گراں گذرتی تھی خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مصرع ثانی میں ضمیر اضافی (ہمارا) موجود ہو اس کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ اصلاح نے شعر کو خاک سے پاک کر کے آسمان پر پہونچا دیا۔

شعر مائل مرا ان کا ہوا جب معاملہ درپیش محشر میں تو بولے اہل محشر طے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

اصلاح "معاملہ" بر وزن مقابلہ ہے۔

توضیحات:۔ اصلاح میں محولہ بالا ریمارک لکھ کر شعر کو چھوڑ دیا ہے۔ غالباً منشاء یہ ہوگا کہ مائل صاحب بجائے معاملہ کے کوئی اور لفظ رکھیں یا شعر کو خارج غزل کر دیں کیونکہ اس صورت میں

درحقیقت "ع" تقطیع سے گرتا ہے۔

شعرِ مائل نہیں معلوم ہمکو کیا مرض ہے؟ جوکہ اے مائل معالج کوئی دنیا میں ہمارا ہو نہیں سکتا
اصلاح دوا کیسی؟ شفا کیسی؟ یہ دردِ عشق ہے مائل "

توضیحات:۔ "کیا مرض ہے؟" ایسے شعر میں ابہام پیدا ہو گیا تھا اور "جوکہ اے مائل" ایک بھدا ٹکڑا تھا اصلاح نے مرض کی تشریح "یہ دردِ عشق ہے" کرکے "دوا کیسی شفا کیسی" دو ٹکڑے اپنی جانب سے پیوند کرکے شعر کو نہ صرف وسیع پُر زور اور واضح ہی کر دیا بلکہ مصرعۂ ثانی کو چار چاند لگا دئے۔

شعرِ مائل جنازے پر ہمارے (روتے چلاتے) وہ جب آیا کہا اہلِ عزا نے "یا الٰہی! کیا غضب آیا"
اصلاح " (روتا چلاتا) " "

توضیحات:۔ وحدت، جمعیت، تذکیر و تانیث میں از روئے قواعد و محاورہ حال و ذوالحال میں باستثنائے چند صورتوں کے مطابقت لازم ہے۔ مائل صاحب کے شعر میں "وہ روتے چلاتے آیا" قواعد و محاورے کی ایک فحش غلطی تھی اصلاح نے عیوبِ قواعد و محاورہ سے شعر کو پاک و پاکیزہ کر دیا۔

شعرِ مائل نزع میں ہائے آیا جبکہ وہ میری عیادت کو اجل کہنے لگی اس سے کہ تو آیا تو (کب) آیا
اصلاح (اب) "

توضیحات:۔ مرنے کے بعد اگر آمدِ محبوب دکھائی گئی ہوتی تو "کب" زیادہ موزوں ہو سکتا تھا، لیکن شعر میں دم توڑنے کے وقت آمد کا اظہار کیا گیا ہے جس کے لئے "اب" سے زیادہ منظر کش دوسرا لفظ ممکن نہیں۔ حاملانِ مذاقِ سلیم سمجھ سکتے ہیں کہ ذرا سے تغیر نے شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا اور "فصیح الملک اسکول" کی خصوصیات سے وہ کتنا پُر ہو گیا ہے۔

شعرِ مائل یا رہی کے در پہ ہم تو جان دیں گے اے جنوں تو ہوا آباد جا کر دشت میں دیوانہ تھا
اصلاح ہم تو اپنی غیرتِ لیلیٰ کے در پہ دیں گے جان قیس نے صحرا نوردی کی بڑا دیوانہ تھا

توضیحات:۔ اس شعر میں مائل صاحب سے چند در چند لغزشیں ہوئیں۔

(۱) "یار" میں کوئی خاص ایسی کیفیت پیدا نہ کر سکے جو جنوں خیز ہوتی، کوئی ایسی ادا نہ دکھا سکے جو عاشق کو آمادۂ جاں نثاری کرتی اور اس کو مجنوں سے افضل و اعلیٰ بنا کر ایسے مجنوں کا مضحکہ اڑانے کا موقع دیتی اصلاح میں "غیرت لیلیٰ" لکھکر اس کمی کو بدرجۂ اتم پورا کر دیا اور معشوق کی شان کو بڑھاتے ہوئے عاشق میں مجنوں سے زیادہ بہتر جذبات توفیق پیدا ہونے کیلئے زمین تیار کر دی۔

(۲) دوسرے مصرع میں مائل صاحب نے جنوں کے متعلق دو امر بیان کئے۔

(الف) "تو ہوا آباد جا کر دشت میں"

چونکہ جنوں نہیں بلکہ صاحب جنوں کسی جگہ جا کر آباد ہو سکتا ہے۔ جنوں کو بھی آبادی سے سروکار نہیں ہوتا اور یہ بھی غلط اس لئے یہ تخاطب ایک خیال خام تھا۔

(ب) "دیوانہ تھا" جنوں سراپا دیوانگی دیوانہ گن ہی اسلئے اسکو دیوانہ کہنا تکلّف محض و امر مہمل ہے۔

اصلاح نے "لیلیٰ" اور "دیوانہ" کی مراعاۃ سے "قیس" کا اضافہ کر کے اسکے ساتھ اس کے عالم جنوں کے کارِ نمایاں "صحرا نوردی" کو ایک کارِ عبث اور دلیل کوتاہی کم ہمتی ٹھیرا کر قافیہ میں ایک پُر لطف صفت "بڑا" کا اضافہ اور کر دیا، جس نے قطع نظر اس امر کے کہ شعر کو محاورے کی کان اور روزمرہ کی جان بنا دیا قافیہ اور ردیف دونوں میں ایک روح تازگی پھونکدی اور اسطرح ایک لایعنی شعر لیلیٰ کی کمی، مجنوں کی کوتاہیوں اور اسکے مقابلہ میں ایک عاشقِ کامل کے سچے اور صحیح جذبات کا آئینہ بن گیا اور شاگرد کے جواہر افکار اور لآلیِ جذبات نے جو اس کے دل و دماغ سے نکلکر غیر واضح الفاظ اور مہمل حزف داکے سنگ ریزوں میں پوشیدہ ہو گئے تھے صاف و شفاف ہو کر صرف اہل بصیرت کی نظر میں قدر و قیمت ہی حاصل نہ کر کے خراج، داد و تحسین وصول نہ کر لیا بلکہ صحیح ترجمانی خیالات اور جذبات کے حسنِ ادا کا اس کو ایک عملی سبق بھی مل گیا۔

یہ ہیں وہ اصلاحات مشت نمونہ از خروارے یکسی ہیں؟ اور مولانا احسن کے اس فقرہ کا کیا مطلب تھا "اس مسئلہ کو یونہی رہنے دو" یہ ناظرین کے فیصلہ کے لئے چھوڑتا ہوں میرا فیصلہ مضمون کے عنوان سے ظاہر ہے۔

ظہیر علوی۔

وَاتَّبِعُوْا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ

نثرِ احسن

از غلام مصطفےٰ خاں۔ ایم، اے، ایل ایل بی (علیگ)
کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار)

جدید اُردو نثر بے شک غالبؔ کے خطوط سے شروع ہوئی لیکن سرسید ہی اس کے باوا آدم کہلائے جائیں گے۔ انہوں نے شروع سے آخر تک اپنی تالیف و تصنیف میں صرف اُردو ہی کا دخل و عمل رکھا اور ایسی سلیس اُردو لکھی جو اپنے وقت کی اُلجھی ہوئی ترکیبوں اور بعید الفہم اسلوبوں سے دور ہو کر سہلِ ممتنع کی اعلیٰ مثال قائم ہوئی۔ پھر آزاد کی مرصع کاری، ڈپٹی نذیر احمد کی لفظی و معنوی وسعت، مولانا حالیؔ کی یکرنگی و متانت اور "رشکِ لکھنؤ و دہلی" یعنی مولانا شبلی کی جامعیت نے اُردو نثر میں چار چاند لگا دئے۔ مؤخر الذکر کے متعلق حضرت احسنؔ مارہروی نے صحیح لکھا ہے کہ "آج جتنے مشاہیر معاصرینِ ادب ہیں وہ اسی معلّمِ ادب (شبلی) کے ہم سبق یا ہم روش یا مقلد نظر آتے ہیں۔" ؎۱

چنانچہ ان مصلحین کی وجہ سے ہماری نثر میں ہر قسم کے خیالات و جذبات کے ادا کرنے کے لئے پوری پوری صلاحیت پیدا ہو گئی اور اب علوم و فنون کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو ہماری زبان کی حدود سے باہر جا سکے۔

عصرِ حاضر کے جن مشاہیر ادبا کا قلم پوری روانی کے ساتھ ادبی خدمت میں معروف ہے ان کی صفِ اوّل میں حضرت احسنؔ مارہروی کی ذاتِ گرامی صفات فراموش نہیں کی جا سکتی شروع جوانی سے آخر دم تک اردو ادب کی جتنی خدمت انھوں نے کی ہے اس کی مثال مشکل مل سکتی ہے۔ اُن کی زندگی کا شاید ہی تھوڑا عرصہ ایسا گزرا ہو جب کہ انھوں نے ادبی یا اخلاقی

؎۱ تاریخ نثر اُردو۔ صفحہ ۳۵۲۔

خدمت سے عمداً اجتناب کیا ہو۔ وہ اگر تعلیم میں اُطْلُبُ الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ پر عمل رکھتے تھے تو ساتھ ہی تعلیمی اور اخلاقی خدمات میں اَحْسَنُ النَّاسِ مَنْ اَحْسَنَ عَیْشَ الْغَیْرِ فِیْ عَیْشِہٖ کے مصداق پر یقین رکھتے تھے کہ:۔ ع نام کے ساتھ ترا کام بھی احسن ہو گا۔

جن لوگوں نے پچھلے ادیبوں کی صحبتیں اٹھائی ہیں اور بالخصوص داغ دہلوی۔ آمیر مینائی اور علامہ شبلی جیسے بزرگوں سے استفادہ کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ کم از کم اپنے شعبے میں ان حضرات کی وسعتِ نظری کیا تھی اور اس پر انھیں کتنا قابو حاصل تھا۔ یہی شان حضرت احسن کے علم کی تھی اسی لئے اُن کی "باقیاتِ صالحات" شروع سے آخر تک ادب اور ٹکسالی زبان کی جان ہیں۔ جن کا ہر لفظ مستند اور ہر ترکیب معتبر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ علامہ شبلی کی طرح انکی شاعری میں بھی کسی "نگار" کے "راز و نیاز" نہ پائے جائیں۔ لیکن اس سے ان کے کمالِ شاعری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیوں کہ وہ صرف "موزونی طبع" نہ رکھتے تھے جو صرف "ایک ودیعتِ فطری ہے اور اکثر معمولی پڑھے لکھے نہایت دلچسپ وخاطر نشین شاعری کرتے اور کرسکتے ہیں۔ مگر کوئی نقد سخن کا پرکھنے والا نہیں کہہ سکتا کہ ایسے شاعر اصطلاحاتِ علوم و فنون اور مناسب و موزوں تشبیہات و تلمیحات، جدت آمیز خیالات اور صحیح جذبات و محاکات کو اس طرح بے تکلف ادا کرسکتے ہیں کہ وہ محض اُن کی قوتِ متخیلہ اور انھیں کی پروازِ فکر کا نتیجہ معلوم ہوں۔ ہمیشہ ایسے طبعی موزوں طبع پیش پا افتادہ معاملات و واقعات سے آگے قدم نہیں بڑھاتے اور اگر کسی تقلیدی جوش میں زیادہ پرواز کرنی چاہتے ہیں تو اُن غریبوں کو موزوں و مناسب الفاظ نہیں ملتے اور اس لئے نہیں ملتے کہ اُن کی سرحدِ معلومات سے آگے ہوتے ہیں۔" ع[۲]

یہ بحث بظاہر جملۂ معترضہ سے زیادہ نہ معلوم ہوگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسی کی پرکھ سے حضرت احسن کی نثر کا صحیح اندازہ ہوسکے گا۔

ع۲ مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ صفحہ ۲۷۔

میں یہ مانتا ہوں کہ حضرت احسن نثر میں کسی خاص طرز کے موجد نہ تھے لیکن جس سلاست و نفاست، روانی و یکرنگی کے ساتھ اُن کا قلم جاری رہا اُس کا صحیح اندازہ صرف اُن حضرات کو ہو سکتا ہے جنہوں نے اُن کی تحریر و تقریر کو تعصب کی عینک کے بغیر دیکھا ہو۔ سلیس ادبی زبان کا لکھنا ہر شخص کا کام نہیں، اس صاف اور ہموار میدان میں قدم قدم پر پھسل پڑنے کا خوف رہتا ہے۔ قرآن پاک ہی کو دیکھئے کہ سینکڑوں سال گزر گئے اور گزر جائیں گے، لیکن اُس کی اعلیٰ سلاست کو مسلمان تو کیا، دشمنانِ اسلام بھی بلند ترین معیار سے نیچے نہیں دیکھ سکے اور نہ اس بات کی تاب ہے۔ بس حقیقت تو یہ ہے کہ سلاست کے ساتھ ساتھ زبان کو ایسے اعلیٰ معیار پر قائم رکھنا کہ کہیں جھول جھال نہ ہو اور عام و عوام کی زبان سے نہ ٹکرا جائے، ایک ایسا کمال ہے جو ہر ادیب کو بھی حاصل نہیں اور جس پر بیسیوں طرز اور صاحبانِ طرز قربان ہیں۔ آیئے آج ہم آپ کو اپنے بزرگ استاد کی اس سلاست کے ایسے جواہر پارے دکھائیں کہ بزم ادب پُر نور ہو جائے۔

(۱) مذکورہ بالا تمہید کے ساتھ مناسب ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت احسن کی نثر کی تمہیدیں ہی پہلے شروع کی جائیں جس طرح اُن کی غزلوں کے مطلعے بہت زوردار ہوتے تھے۔ مثلاً:۔

؎ بارہا تو نے کہا سب کچھ کیا کچھ بھی نہیں	تجھکو اے پیماں شکن پاسِ وفا کچھ بھی نہیں
؎ نہ ہوں الفاظ جسمیں اُس زباں میں داستاں کہیے	نئے انداز سے افسانۂ دردِ نہاں کہیے

اُسی طرح نثر کی تمہیدیں بھی بہت زوردار اور پُرشکوہ ہوتی تھیں۔ چند نمونے نذرِ ناظرین ہیں لفظ "چاہیے" پر بحث ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:۔

"قواعدِ زبان کے باضابطہ اور مکمّل و مدوّن نہ ہونے سے جو جو دقّتیں پیش آتی ہیں انکے لئے بجز تدوینِ قواعد کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کہاں تک کیا جائے کہ لفظ لفظ کی تحقیق ایک جداگانہ اہتمام سے کی جائے۔ مستثنیات اور اختلافاتِ قواعد ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ مگر اُردو کی حالت سب سے نرالی ہے۔ قدم قدم پر الجھاؤ، جگہ جگہ اٹکاؤ موجود ہے۔ دیکھئے اس منتشر اور غیر محدود زبان کی قسمت کب جاگے اور اہلِ ادب قواعد کی ترتیب پر کب مستعد ہوں۔۔۔" [۳]

---

[۳] رسالہ فصیح الملک۔ اپریل ۱۹۰۶ء۔

"تضحیکِ واعظ و محتسب" کے متعلق بحث کی ابتدا اس طرح ہے:-

"ایشیائی شعرا کے کلام میں جہاں بیسیوں بندھے ٹکے مضمونوں کی جگالیاں ہوتی رہتی ہیں وہاں واعظ و محتسب اور دوسرے مذہبی نمایندوں پر گالیاں بھی ضرور پڑتی ہیں جس طرح ہندوستان کے مہذب سے مہذب اور شریف سے شریف پُرانے گھرانوں میں منجملہ دیگر رسوم کے میراثنوں کی گالیاں اور ٹونوں کے بغیر شادی بیاہ کی تقریبیں سونی اور بے رونق سمجھی جاتی تھیں اسی طرح شعرا کی غزلیں گویا ناتمام رہتی ہیں جب تک کسی مشیخت مآب کو دوچار صلواتیں نہ سنائی جائیں اور یہ بدعت ہندوستان کی نہیں ہے بلکہ شعرائے ایران کی اُپج ہے ...." ؎۴

"امیر و داغ کا مقابلہ" اس طرح شروع کرتے ہیں:-

"امیر کا رنگ داغ کے رنگ سے آسان ہے یعنی وہ رنگ جو امیر کے پہلے دیوان پر چھایا ہوا ہے، رعایتِ لفظی، مضمون آفرینی اور خیال آرائی میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ طرز واسلوب ہر شاعر معمولی کوشش اور فکر سے پیدا کر سکتا ہے۔ برخلاف داغ کے کہ داغ کا رنگ جدتِ ادا، شوخیِ بیان اور جذباتِ حقیقی سے مرکب ہے۔ جس میں لفظوں کا طلسم نہیں، معنی کا جادو ہے۔ ساخت نہیں، بے ساختگی ہے اور یہ سعادت بزورِ بازو نہیں ملتی۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ناسخ و وزیر کے انداز میں ایک امیر نہیں، سینکڑوں باکمال نظر آتے ہیں مگر داغ اپنے رنگ میں منفرد اور یکتا ہیں۔ نہ اُن سے پہلے اس انداز میں کوئی کامل نظر آیا۔ نہ اب تک کوئی اُن کی پوری پوری تقلید کر سکا ....." ؎۵

(۲) حضرت احسن جس طرح اپنی گفتگو میں روزمرہ۔ محاورات اور امثال کا استعمال زیادہ

؎۴ مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ صفحہ ۴۷۔

؎۵ رسالہ "ہمایوں"، نومبر ۱۹۳۹ء۔ صفحہ ۸۱۷۔

رکھتے تھے اُسی طرح اپنی شاعری اور نثر میں بھی نہایت برجستگی کے ساتھ لے آتے تھے۔ مثلاً:۔

"...... یہاں خواہ مخواہ کسی کو اصرار نہیں کہ ذرا ذرّے ہی سے بنا یا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ برساتی کیڑوں کی طرح لشکرِ اُردو کی گرد سے ظاہر ہوا ہو۔ مگر جہاں تک ظاہری قیاسات اور قدیم اتفاقِ کتابت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہی آسان بات معلوم ہوتی ہے کہ ذرا ذرّے سے لیا گیا ہے۔ ...... یہ کہنا کہ متاخرین نے (اِس ذال کو متروک کردیا ہے بڑے دھوکے کی ٹٹّی ہے۔ کیونکہ متروک ذرّے کا تلفظ ہوا ہے نہ ذرا کی کتابت۔ ...... جناب ...... نے الفاظ عربی عظمت، ذکر، ذریعہ وغیرہ کا تذکرہ کس بے پروائی سے کیا ہے اور اپنے خیال میں کس خوبصورتی سے وہ الزام اپنے اوپر سے ہٹا یا گیا ہے حال آں کہ یہی جگہ پانی مرنے کی ہے۔......"[۶]

کچھ اور ملاحظہ فرمائیے:۔

"نیچرل شاعری کے حامی جو ہماری پُرانی شاعری کو آنکھوں پر پٹی باندھکر کُند چھری سے ذبح کر رہے ہیں اُن کو چند داؤ بہت رواں ہیں اور جہاں کہیں اس قسم کی بحث چھڑتی ہے تو وہ یا تو گل وبلبل کی داستانِ پارینہ کے بار بار دُہرانے کی شاکی ہوتے ہیں یا کمر و دہن کی فرضی تشبیہوں پر مُنہ آتے ہیں۔ ...."[۷]

اور سنئے:۔

"....... خواجہ صاحب کی طرزِ نگارش دوسرے رُوسائے تحریر کی طرح نوشتۂ موسیٰ نہیں، جس کا پڑھنے اور سمجھنے والا خدا کے سوا بندگانِ خدا میں کوئی نہ ہو۔... (لیکن) آسان اور سلیس اندازِ تحریر کی یہ شان قابلِ تعریف نہیں کہ لفظی سادگی کی پرواز کے ساتھ معنوی روح بھی ہوا ہو جائے۔ ...."[۸]

---

[۶] "فصیح الملک" منقول از اختلافات اللسان صفحہ ۴۶۔

[۷] مقدمۂ یادگارِ داغ۔ صفحہ ۱۳۔

[۸] تاریخ نثر اُردو۔ صفحہ ۲۰۵۔

چند مثالیں صرف ایک ہی تحریر یعنی مقدمۂ کلیاتِ ولی سے دیکھ لیجئے:-

"۔۔۔۔۔۔ اس دیوان کی ترتیب میں لگاتار دو ڈھائی سال صرف کرنے پڑے اور باوجود خاص کاوش و محنت کے اپنی خامی کی وجہ سے اب بھی ایک آنچ کی کسر معلوم ہوتی ہے ۔" [9]

"شعر نمبر۔۔۔۔ کو خلافِ فطرت کہا جا سکتا ہے حال آں کہ سینگ کے اوٹ پہاڑ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔" [10]

"۔۔۔۔۔ (یہ) دیکھنے میں ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ایسی گہری چٹکی لی ہے جو نیل ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی اور جس سے اُن کی ملمع سازیوں کی ساری قلعی کھُل کر اصلی فطرت کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔۔۔۔۔۔" [11]

"۔۔۔۔۔ (شاعر) جہاں اپنا ذکر کرتے ہیں وہاں اکثر اتنے اونچے جاتے ہیں کہ اُن کی زبانی سُنی ہوئی پستی پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔۔۔۔۔۔" [12]

(۳) مولانا عبدالحق صاحب کی طرح حضرت احسن بھی ہندی کے میٹھے میٹھے الفاظ اِس خوبی سے ادا کر جاتے ہیں، کہ فصاحت کی جان کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ ذیل میں ہم ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جو "محاورات" کے ذیل میں بھی آ سکتی تھیں لیکن اُن کی خوبیوں نے یہاں علیحدہ عنوان قائم کرنے پر مجبور کیا۔ سنئے اور لطف اٹھایئے: "اُردو خطوط نویسی کا پتا ۱۸۵۰ء سے پہلے نہیں چلتا اور اس زبان میں پہلا خط لکھنے والا مرزا غالب کے سوا دوسرا نظر نہیں آتا۔۔۔۔ انیسویں صدی عیسوی میں ۳۰-۳۲ برس بعد اُردو کو دفتر میں جگہ ملی۔ مگر فارسی کا اتنا گہرا اثر چھایا ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی ہندوستانی لکھے پڑھے فارسی ہی میں خط پتر لکھا کرتے تھے۔۔۔۔۔ اُردو اس وقت

---

[9] مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ صفحہ ۶۔
[10] ایضاً۔ صفحہ ۳۹۔
[11] ایضاً۔ صفحہ ۴۹۔
[12] ایضاً۔ صفحہ ۵۶۔

تک کتابی زبان نہ تھی، بول چال سے آگے اس کی بات پوچھی نہیں جاتی تھی ..... "[۱۳]

حضرت احسن کی مختلف تحریروں کے بجائے صرف ایک کتاب "تاریخ نثر اُردو" ہی سے ایسی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں۔ اُن میں سے چند یہ ہیں :-

"...... ہندوستان کے صوبۂ شمال و مغرب میں اورنگ زیب کے بعد چند اننے گنے لوگ اس طرف ڈھلکے اور انھوں نے اردو کو سینوں سے نکال کر سفینوں میں رکھنا شروع کیا۔"[۱۴]

"..... اُس (فارسی) کے مقابل میں لاوارث اُردو کہ مالِ یغما سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی اور پھر یہ کہ اس کا سودا سات پانچ کی زبانوں سے مل کر بارہ باٹ ہو رہا تھا، کس مُنہ سے فارسی کی ہمنوائی کر سکتی تھی ...."[۱۵]

"مسلمانوں کی اس حرکت نے ہندوؤں کو بھی نچلا بیٹھنے نہیں دیا اور اب وہ بھی اپنے ہلکے پھلکے بیان کو سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے ملاکر (گنگھل) کرتے جاتے ہیں۔"[۱۶]

"...... ان کا انداز بیان بہت اکھڑا اکھڑا اور نامربوط ہے ......"[۱۷] وغیرہ وغیرہ۔

(۴) لیکن اِن ہندی الفاظ و محاورات کے علاوہ حضرت احسن کے قلم سے عربی امثال و محاورات بھی اس برجستگی کے ساتھ نکلتے ہیں کہ اجنبیت کے بجائے ایک خاص قسم کی روانی اور بلاغت پائی جاتی ہے جس کا اندازہ صرف مثالوں سے ہی ہو سکتا ہے :-

"..... اس مبحث تحقیق میں ابتداءً اپنی پسپائی سے میں بھی طابِقَ النَّعلُ بالنّعل بنا رہا۔ مگر دل میں یہ خلش برابر رہی کہ جب صوبۂ دکن میں اب سے پانسو برس پہلے کا سرمایۂ نظم

---

[۱۳] "ہماری زبان" یکم ستمبر ۳۹ء۔ صفحہ ۹۔

[۱۴] تاریخ نثر اُردو۔ صفحہ ۱۰۔

[۱۵] ایضاً۔ صفحہ ۲۲۔

[۱۶] ایضاً۔ صفحہ ۳۰۔

[۱۷] ایضاً۔ صفحہ ۴۳۔

دستیاب ہوتا ہے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بکثرت نہ سہی، بہ قلت ہی نثر اردو کا کوئی نمونہ نہ ہو؟ ـ ـ ـ ـ ـ ـ" ع۱۸

"ـ ـ ـ ـ ـ بہرحال ہم نے یہ سمجھ کر کہ ہمارے مقرر کردہ ایک دور کا نمونہ ہے اس لئے اُنْظُرْ مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ مَنْ قَالَ کے تحت میں نقل کر دیا گیا۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ" ع۱۹

اور ملاحظ فرمائیے :-

"ـ ـ ـ ـ ـ ـ غلط نویسی اور اختصار و اصلاح کو دیکھ کر مسرت کے عوض کلفت ہوئی، پھر بھی مَالَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے دیوانِ مذکور تبرک سمجھکر حرزِ جان بنایا گیا۔۔۔" ع۲۰

"حتی الامکان اِس کی تصحیح میں سخت محنت کی گئی ہے (اور) دس بارہ مختلف مطبوعہ غیر مطبوعہ دیوانوں سے مرۃ بعد اُولیٰ و کرۃ بعد اُخریٰ مقابلہ کیا گیا ہے۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ" ع۲۱

"ـ ـ ـ ـ ـ قضائے مبرم ایک ایسا مستقل اور اٹل فرمانِ واجب الاذعان ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک بدستور رواں رہے گا۔ ضروری سے ضروری، سخت سے سخت اور اہم سے اہم معاملات و احکام آگے پیچھے ہو سکتے ہیں۔ مگر اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ" ع۲۲

(۵) حضرت احسن کی سلیس نثر میں صنائع لفظی و معنوی کی آمیزش اِس بے تکلفی اور برجستگی کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ تصنع کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ میرے اِس دعوے کو ذیل کی مثالیں دیکھکر پرکھئے۔

ع۱۸ تاریخ نثر اردو۔ صفحہ ۲۱۔

ع۱۹ ایضاً۔ صفحہ ۶۳۔

ع۲۰ مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ صفحہ ۳۔

ع۲۱ ایضاً۔ صفحہ ۳۲۔

ع۲۲ علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج میگزین۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۳۔ اِن مثالوں کو معمولی اُلٹ پلٹ ہی سے جمع کرلیا ہے! اگر کچھ اور ملاحظہ فرمانا ہو تو کارنامۂ غم صفحہ ا۔ مقدمۂ تخمین صفحہ ۲۴۔ وغیرہ میں بھی اچھی مثالیں مل سکیں گی۔

(الف) تجنیسِ مطرّف کی ایک نہایت اچھی مثال دیکھئے۔

"...... بااین ہمہ اِس اندازِ گفتگو سے کم ازکم اتنا سراغ ضرور چلتا ہے کہ گوینده اپنے زمانے کے نمایندوں میں ہے۔ کیونکہ جب تک مقابل میں کوئی حریف نہیں ہوتا فطرتاً لاگ کی آگ نہیں سُلگتی........" ۲۳

(ب) تجنیسِ تام کی ایک برجستہ مثال ملاحظہ ہو۔ یہاں لفظ "پتا" اور "پتا" کے استعمال کی خوبی دیکھئے:۔

"...... یہ ہیں تو نے اُن پُرانے خطوں اور پتوں کے جن کا پتا اب نہیں ملتا۔۔" ۲۴

(ج) تجنیسِ محرّف کو کس خوبی سے بنا ہا ہے "چَھپنا" اور "چُھپنا" کی مثال میں دیکھئے:۔

مجھے اپنے گرامی نامہ مؤرخہ ۲۰ر جولائی ۳۸ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"...... اب اُن (داغ) کے کلام کا انتخاب کیا ہے جس میں یہ التزام ہے کہ عطف و اضافت فارسی نہیں ہے۔ مقدمہ لکھنا شروع کرنے والا ہوں۔ انتخاب تمام ہو گیا ہے جب وہ چھپے گا آپ سے بھی چُھپا نہ رہے گا۔۔۔۔۔"

(د) تلمیح کی ایک لاجواب مثال ملاحظہ فرمائیے۔

مجھے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۵ر اپریل ۳۸ء میں اپنے سب سے پُرانے شاگرد حضرت کلیمؔ جبلپوری کے متعلق ارقام فرماتے ہیں:۔

"... کلیم صاحب کا کوئی خط مجھے اِس وقت تک نہیں ملا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ کلیم نے مَن رانی کہہ کر لَن ترانی جواب میں سُنا تھا اب کلیم کے مشتاق وہی جواب سُنتے ہیں۔ یہ قدرت کے تماشے ہیں۔ اُن سے کہہ دیجئے گا کہ میں بہر حال دعا گو ہوں اور رہوں گا...."

---

۲۳ مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ صفحہ ۵۷۔

۲۴ "ہماری زبان" یکم ستمبر ۳۹ء۔ صفحہ ۹۔

(۵) شبہِ اشتقاق کی ایک برجستہ مثال دیکھئے :-

"...... اثنائے قیام میں ایک دن کتب خانۂ آصفیہ کی سیر بھی میسّر ہوئی ....." ع۲۵

ان کے علاوہ مقفّیٰ نثر اور الفاظ کی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً :-

"مرزا غالب کی عبارتوں کا بڑا حصّہ، سادگی اور صفائی، ظرافت اور شوخی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ مگر کہیں کہیں مسجّع اور مقفّیٰ ترکیبیں ان کی نثر کو نسبر بالِ طاؤس اور انتخاب صراح و قاموس بنا دیتی ہیں۔ ......" ع۲۶

"..... لیکن روایت و رویت، تخمین و یقین، اور تخیّلات و مشاہدات میں خواب و بیداری کا فرق ہے۔ جس نے بچشم خود ایک دو دن نہیں، برسوں شبانہ روز کی صحبتوں میں یہ رنگ نہ دیکھا ہو وہ کوئی قیاسی و افواہی بات کب سُن سکتا ہے ....." ع۲۷

(۶) حضرت احسن کی نثر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا استدلال بہت جچا تلا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس استدلال میں زورِ بیان بہت پایا جاتا ہے۔ مثلاً :-

"..... جہاں تک ظاہری قیاسات اور قدیمی اتفاقِ کتابت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہی آسان بات معلوم ہوتی ہے کہ ذرا ذرے سے لیا گیا ہے .... یہ کہنا کہ متاخرین نے (ذال) متروک کر دیا ہے بڑے دھوکے کی ٹٹّی ہے کیونکہ متروک ذرّے کا تلفظ ہوا نہ ذرا کی کتابت .... (اور) کتابت کے لئے عادت قدیمہ کا لحاظ ضروری اور نہایت ضروری ہے ورنہ اس سہل پسند زمانے میں اُردو کتابت کی کیا کچھ کایا پلٹ نہ ہو جاتی۔

کتابتِ قدیمہ کے سوا دوسرا ثبوت یا قیاس ذرّے سے ذرا کے بننے کا یہ ہے کہ جو الفاظ

ع۲۵ مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ صفحہ ۱۔

ع۲۶ "ہماری زبان"۔ یکم ستمبر ۳۹ء۔ صفحہ ۹۔

ع۲۷ علی گڑھ میگزین۔ مارچ ۴۳ء۔ صفحہ ۔

معرّب و مفرّس یا مہنّد ہوتے ہیں وہ اپنی اصل سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ...... یہ صحیح خیال ہے کہ بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جو نہ معرّب ہیں نہ مفرّس، مگر متحد الصّوت ہیں۔ لیکن یہ امر لازمی ہے کہ ہر متفق الصّوت لفظ مفرّس و معرّب ہوگا۔ کیا کوئی صاحب ایسا لفظ پیش کر سکتے ہیں جو معرّب و مفرّس ہوا اور متحدّ الصّوت نہ ہو؟ یہ بات دوسری ہے کہ اہلِ عرب (ب) کی جگہ (ف) اور (ت) کی جگہ (ط) اور فارس والے ص کی جگہ (س) وغیرہ داخل کر لیں۔ تیسرا خیال اور منصفانہ قیاس ذرا میں ذ ل ہونے کا یہ ہے کہ خاص اردو میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن میں عربی کے حروفِ مخصوص شامل اور برابر لکھے جاتے ہیں جن پر ذرا بھی توجہ نہیں کی جاتی ذال تو عربی کا مخصوص حرف بھی نہیں۔

...... وہ ذرا میں (ز) صرف اس وجہ سے لکھتے ہیں کہ وہ اُردو کا لفظ ہے۔ پھر کیا وجہ کہ محرم میں حائے حطی۔ علیک سلیک میں (ع)، صاحب بہادر، صافی، صحنک، صدر بورڈ وغیرہ میں (ص)۔ طرارے، طبلچی، طغنے دینے، طوایف وغیرہ میں (ط)۔ حاضری، حربے ضربے میں (ح۔ ض)۔ ذات پات، ذائقہ، ذوق، ذیل، ذلیل میں (ذ) لکھی جاتی ہے؟ کیا یہ اُردو کے الفاظ نہیں؟۔ کیا ان الفاظ کے بعض معنی اُردو کے لئے مخصوص نہیں؟۔ کیا یہ معنی عربی میں بھی مستعمل ہیں؟ کیا یہ الفاظ مہنّد ہیں؟۔ میرے خیال میں اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ان کی کتابت اسی طرح ہوتی چلی آئی ہے اور یونہیں ہوتی چلی جائے گی۔ شاید کسی صاحب کو یہ شبہ ہو کہ الفاظ مذکور اصل میں عربی ہیں۔ اُردو میں صرف معنوی اختلاف ہے۔ جس کے سبب سے کتابت نہیں بدل سکتی۔ اس کے جواب دو ہیں۔ اوّل یہ کہ مہنّد و مفرّس ہو گیا تو ..... انھیں حروفِ مخصوص سے لکھنا چاہئے جو اس زبان کے لئے ہیں۔ دوسرا جواب وہی ہے ..... کہ اکثر الفاظ تو ایسے ہیں جو بجنسہٖ مختلف زبانوں میں بعینی مختلف موجود ہیں ...." ۲۸

---

۲۸ رسالہ فصیح الملک، منقول از اختلاف اللسان (وجاہت)۔ صفحہ ۴۶-۴۸۔

یہ مثال کچھ طویل ہوگئی لیکن چونکہ بحث بہت مفید تھی اس لئے نقل کر دی گئی۔ لفظ "چاہئے" کے متعلق بھی ایک مفید بحث سن لیجئے :۔

"۔۔۔۔۔۔ (صرف نمبر (۲) کے چاہئے۔ (یعنی درکار، مطلوب) میں بعض بزرگوں کا اختلاف نظر آتا ہے۔ اور اختلاف بھی معنوی نہیں ہے بلکہ تلفظی و مکتوبی۔۔۔۔۔۔۔۔ اس میں قدیم الایام سے صرف ایک تغیر لفظی دیکھا جاتا ہے۔ یعنی جب اسم جمع ہوتا ہے تو چاہئے کی جگہ چاہییں لکھتے اور بولتے ہیں۔ جیسے اتنی کتابیں چاہییں۔ سب کے مکان ڈھونڈنے چاہییں وغیرہ۔ قریب قریب تمام مصنفین اور ہندوستانی اردو اخبار اسی تلفظ و کتابت کے پابند ہیں۔ مگر بعض اہل لکھنؤ۔۔۔۔۔ میں یہ مطابقت نہیں دیکھی جاتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عرصہ ہوا کہ میں نے کسی صاحب سے اس کی بابت دریافت کیا تھا جس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ چاہئے میں کیجئے، لیجئے کی طرح خود علامت جمع موجود ہے پھر جمع الجمع بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر واقعی یہ خیال اور استدلال صحیح ہی تو حیرت ہے۔ کیونکہ چاہئیے میں جمع وحدت یا تعظیم کا لحاظ صرف صیغۂ امر کے لئے دیکھا جاتا ہے اور کیجئے، لیجئے کی مطابقت اسی میں پائی جاتی ہے۔ (لیکن اس) چاہیئے۔۔۔۔۔۔ میں یہ استعمال کب ہی؟ جس طرح کہ آپ، ان اور تم کے ساتھ چاہئیے بولتے ہیں اسی طرح اُس، مجھ، تجھ، وہ، یہ کے ساتھ بھی۔ جیسے آپ کو چاہئیے۔ اُن کو چاہیئے۔ اُس کو چاہئیے وغیرہ۔ اگر یہ (ی) علامت جمع ہے تو اُس، مجھ وغیرہ ضمیر واحد کے ساتھ یہ اجتماع کیسا؟ اور اگر کتابیں چاہییں، یہ ترکیب غلط ہے تو اور سیکڑوں الفاظ کی جمع (ی۔ن) سے کیوں جائز ہے؟۔۔۔۔۔۔" [۲۹]

ایک اور مثال استدلال دیکھئے :۔

"۔۔۔۔۔۔ نیچرل اور ایشیائی شاعری میں نسبتہً یہ فرق و امتیاز ہے کہ نیچرل شاعر زیادہ تر اخلاقی واقعات یا قدرتی مناظر سادہ اور صاف الفاظ میں نظم کر دیتا ہے، اگرچہ ساتھ ہی اس کے

---

[۲۹] رسالہ فصیح الملک۔ اپریل سنہ ۱۹۰۶ء۔

وہ کبھی ایشیائی مذاق کے الفاظ و ترکیب بھی اپنے ہاں کہہ جاتا ہے مگر چونکہ وہ اس طرح ہوتی ہے جس طرح اُردئیم سفیدی اس لئے وہ نظروں میں نہیں سماتی۔ ورنہ کوئی نیچرل شاعر ایسا نہیں ہے جو ایشیائی شاعری کے اصول نہ برتتا ہو۔ اسی طرح کوئی ایشیائی شاعر ایسا نہیں ہے جو "سچے اور صحیح مشاہدات اور واقعات اپنے خاص مذاق میں نہ بیان کرتا ہو۔ مگر چونکہ پرانے مذاق کے مقابلے میں یہ رنگ ایسا ہے جیسے کھچڑی میں نمک اس لئے دوسروں کو اس کا مزا نہیں آتا۔..." [۳۰]

(۷) اب حضرت احسن کی زبان کی بلاغت، گھلاوٹ اور شگفتگی کی چند مثالیں دیکھ لیجئے اور اسی پر مضمون بھی ختم ہے۔

" دریائے انقلاب اور امواجِ تغیر کے مدو جزر نے جتنے جواہر پارے سواحلِ مناظر سے ہم آغوش کر دئے ہیں اُن سب دُرہائے ناسُفتہ کو مختلف نمونوں کی لڑیوں میں پرو دیا ہے، پھر بھی اس سلسلے کی تمام کڑیاں دستیاب نہیں ہوسکیں اس لئے زمانہ وعہد کی مسلسل ترتیب و تنظیم سے قطع نظر کرتے ہوئے مختلف زمانوں میں یعنی بعید سے بعید اور قریب سے قریب کی نثریں پیش کی گئی ہیں اور تا بقدر والتزام کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے مشہور صوبوں سے ہر قسم کی تحریروں کے مرقع پیشِ نظر ہو جائیں جن میں ہر رنگ اور ہر طبقے کے مشہور و معروف محرر و مقرر کی طرزِ نگارش و گزارش موجود ہو..." [۳۱]

" ندوۃ العلما کی کوششوں سے جس گلشنِ علم و عمل کا وجود قائم ہوا اُس کے برومند نونہالوں کی چمن بندیوں نے حسبِ امید دنیائے ادب میں ایک خاص فضا پیدا کر دی ہے انھیں چمن آفرینوں کی پھلواریوں میں وہ چند سربرآوردہ ہستیاں ہیں جن میں مؤلفِ شعرالہند بھی شامل ہیں......" [۳۲]

---

[۳۰] مقدمۂ یادگارِ داغ۔ صفحہ ۱۵۔
[۳۱] تاریخ نثرِ اُردو۔ صفحہ ۳۵-۳۶۔
[۳۲] ایضاً۔ صفحہ ۲۷۲۔

"قلم اٹھا چکا ہوں، لکھنا شروع کر دیا ہے۔ لکھتا ہوں مگر ہر لفظ پر شبدیز خامہ ٹھوکریں کھاتا ہے، منزل دشوار گزار و ناہموار ہے اور عنانِ راہوار ایک اجنبی سوار کی گرفت میں ہے۔ خدائے کارساز مددگار ہو تو بیڑا پار ہے۔"[۳۳]

ورنہ۔ دو قدم چل چل کے گرتے ہیں طریقِ عشق میں ٹھوکریں ہیں منزلیں اس راہِ ناہموار کی (داغ.....)

ان تمام مثالوں سے ناظرین خود اندازہ لگا سکیں گے کہ حضرت احسن کی نثر کس بلند پائے کی تھی اور انھوں نے اردو ادب کی خدمت کس کس طریقے سے کی تھی۔ انھوں نے سچ فرمایا تھا:۔

سے ہم نہ ہوں لیکن زمانے میں ہمارا نام ہو ایسی ہستی چاہیئے تو مر کے ہم پیدا کریں

اے میرے بزرگ اور شفیق استاد، آپ کی علمی و ادبی خدمات نے اگر علامہ شبلی، اکبر الہ آبادی، شررؔ لکھنوی، جلالؔ لکھنوی، محسنؔ کاکوروی جیسے بزرگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا تو اب بھی ہمیں یقین ہے کہ انصاف کا خون نہ ہو گا! اور بے شک اردو کی رہتی دنیا تک آپ کو فراموش نہ کیا جائے گا۔ سَرَابِ یَدِ خِلکُم جَنَّتِ !

۱۳۵۹ھ

---

[۳۳] مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ صفحہ ۔

۷۸۶

آہ احسن مرحوم

از الحاج جناب مولانا مولوی محمد کرم علی صاحب ملیح آبادی ناظم جمعۃ العلماء صوبہ متحدہ جج کمیٹی لکھنؤ یو-پی- و ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ
وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

ترجمہ:- اس سے بہتر کس کا کلام ہو سکتا ہے، جو خدا کی طرف بلائے اور خود بھی نیک عمل کرے اور اپنے کو مسلمانوں میں سے کہے۔

جولائی کی ۱۳ تاریخ کو میرے محترم دوست ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے آمو نکی دعوت میں علی گڑھ مدعو کیا تھا۔ اس لئے صبح اُن کی کوٹھی پر پہونچا۔ ۸ بجے صبح ان کے ساتھ کالج گیا۔ وہاں احسن صاحب سے ہاشمی صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی رخصت ہوتے وقت معلوم ہوا کہ آپ بھائی احسن صاحب مارہروی مرحوم کے صاحبزادہ ہیں لوٹ کر پھر اُن کے کمرہ میں آیا اُن سے بغلگیر ہوا، اپنے تعلقات کا ذکر کیا۔ احسن میاں صاحب نے فرمایا کہ والد مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات ایک رسالہ کی صورت میں مرتب ہو کر زیر طبع ہیں آپ سے مرحوم کے تعلقات تھے جو حالات پیش نظر ہوں اس مختصر وقت میں اختصار کے ساتھ قلمبند فرما دیں بھائی احسن صاحب مرحوم ظاہری صورت میں ایک شاعر نظر آتے تھے۔ بہت سے حضرات اُنکو شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن اُن کے خاندانی اوصاف سے ناواقف تھے مگر اُن میں تصوف کا خاص رنگ تھا وہ دور جدید کے ایک بہترین صوفی منش بزرگ تھے لوگوں سے ملنے جلنے میں اپنی قابلیت کو بہت چھپاتے تھے مگر وہ اپنے اندر ادبی ٹھوس قابلیت رکھتے تھے مسلمانان کانپور کی تعلیمی و اقتصادی و امتیازی کیفیت کو دیکھ کر ایک مختصر سی جماعت مسلمانوں میں کام کرنیکے لئے قائم ہوئی جس میں نہ کوئی عہدہ دار تھا نہ انجمن کا کچھ نام تھا۔ ایک چھوٹے سے احاطہ امین گنج

میں یہ چھوٹی سی جماعت قائم ہوئی حضرت مولنا آزاد سبحانی صاحب یہ ناچیز بھائی احسن صاحب مارہروی مرحوم واحد یار خاں صاحب مرحوم بی اے الہ آبادی۔ ان اصحاب پر یہ جماعت مشتمل تھی سب سے اوّل احسن بھائی مرحوم کی یہ تجویز ہوئی کہ پہلے یہاں ایک مسجد تعمیر ہو جس میں شام کو مولنا آزاد صاحب ۵ امنٹ اسلامی اصول پر لکچر دیا کریں، دو صاحب اور جن کا اس وقت نام نہیں یاد ہے اُن کے ذمہ اس کی تبلیغ رکھی گئی خود اُنہوں نے اپنے ذمہ غریب بچوں کی تعلیم لی۔ اُن کی اس تجویز کو جناب مولوی محمد امین صاحب مالک ابن گنج نے عملی جامہ پہنایا بعد تعمیر ہونے کام شروع ہوگیا واحد یار خاں صاحب مرحوم نے اقتصادی فلاح کا کام اپنے ذمہ لیا مولوی امام الدین صاحب مدرس مدرسہ الہیات حال جامع مسجد آگرہ نے اپنے ذمہ اس کی تبلیغ لی۔ میرے اور سپرد یہ خدمت کی گئی۔ کہ میں شام کو ہر ایک شخص کے کام کا جائزہ لیکر اس کے کاموں کو جماعت کے سامنے پیش کروں اس طرح تھوڑے دنوں میں اور یتیم خانہ کے کاموں کو دیکھتا رہوں، وہاں صبح کو تقریر کیا کروں واحد یار خاں صاحب نے ایک دوکان کھولی احسن بھائی مرحوم نے سات غریب بچوں کو تعلیم دیکر اسکول میں داخل کرایا۔

جب تک بھائی احسن مرحوم رہے مسلمانوں میں ایک تازہ روح اسلامی و ادبی کا ہنوز ہی پیدا ہوتی رہی آہ ان کی اس ناگہانی موت نے نہ صرف ادبی مجلس کو ماتمکدہ بنایا بلکہ شعرا کی صف کو غمگسار بنایا اور سب سے بڑا نقصان ایک مخلص باخدا مسلمان کے اُٹھ جانے سے مسلمانوں کو پہونچا۔ جنکی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سوتے جاگتے اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور اُن کی گفتگو کا زیادہ تر دار و مدار عمل اور دعوت الی اللہ پر ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اسم بامسمٰی تھے، خدا تعالیٰ مرحوم کو مغفرت تام سے سرفراز فرماوے اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اُن کے قدم بقدم چلنے کی توفیق عطا فرماوے آمین۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

مسدس بیادِ حضرت احسن مارہرویؒ

از مولوی محفوظ الکریم صاحب کلیم
جبل پوری

کیوں نہ لب پر نالۂ و فریاد　　چرخ نے آج کی نئی بیداد
پڑگئی سر پہ ہائے کیا افتاد　　دلِ آباد ہوگیا برباد
نالہ کُن کیوں نہ ہو دلِ ناشاد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

میرے استاد حضرتِ احسنؔ　　شاعرِ بے مثال ماہرِ فن
چل دیے چھوڑ کر یہ دارِ محن　　رہ گیا بے سرو یتیم سخن
شاعری پر پڑی یہ کیا افتاد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

ہائے اُن کا وہ لطف و مہر و کرم　　میری نظروں میں رہتے ہیں ہر دم
اُن کی رحلت کا ہو بیاں کیا غم　　ہے مرے دل کا کچھ عجب عالم
وقفِ نالہ ہے مائلِ فریاد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

خلقِ احسنؔ کا کچھ جواب نہ تھا　　کرم و لطف کا حساب نہ تھا
شاعروں میں وہ کامیاب نہ تھا　　جو کوئی اُن سے فیض یاب نہ تھا
ہل گئی قصرِ شعر کی بنیاد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

سب نے تسلیم کر لیا آخر　　اُن کی ہستی تھی ہستیِ نادر

ایسا استاد کامل و ماہر　　نظر آتا نہیں کوئی شاعر
شاعری کی بجا ہے یہ فریاد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

آسماں پر تھا شاعری کا دماغ　　اُن سے روشن تھا شاعری کا چراغ
طبع رنگین تھی اُن کی گویا باغ　　تھے حقیقت میں یادگار داغ
دل سے جاتی نہیں ہو اُن کی یاد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

داغ کا نام اُن سے روشن تھا　　ان کے دم سے سخن پہ جوبن تھا
قلم اُن کا سخن کا معدن تھا　　حسنِ معنی کلام احسن تھا
لطفِ شعر و سخن ہوا برباد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

دہر میں اب نشاں نہیں ملتا　　ایسا شیریں زباں نہیں ملتا
ڈھونڈھ مارا جہاں نہیں ملتا　　شعر کا آسماں نہیں ملتا
تھا ہر اک لفظ قابلِ اسناد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

ہائے بنتی نہیں ہے کچھ تدبیر　　آ گئی بیچ میں مری تقدیر
یا تھی تقدیر میں یہی تحریر　　مرگِ استاد نے نہ کی تاخیر
کی اجل نے یہ ہائے کیا بیداد
ہے جگر دوز رحلتِ استاد

مرگِ استاد نے غضب ڈھایا　　میرے سر سے اٹھا لیا سایا
ان کو کیا موت کا پیام آیا　　دلِ غمگین کو میرے برمایا

ہائے کیونکر رہوں میں اب دل شاد

ہے جگر دوز رحلتِ استاد

سیرِ دنیا سے ہو گئے تھے سیر　　چاہیئے تھی اجل کو برسوں دیر

اپنی تقدیر کا کہوں کیا پھیر　　یک بیک ہو گیا یہ کیا اندھیر

سال کیا ہو کلیمؔ ہوں ناشاد

"ہے جگر دوز رحلتِ استاد"

۱۳۵۹ھ

قطعۂ تاریخ

از مولوی محفوظ الکریم صاحب کلیم۔ جبل پوری

آج استاد چل دئے افسوس | پڑ گئی سر پہ ہائے کیا افتاد
دہر میں اب نشاں نہیں ملتا | ہائے ڈھونڈھوں کہیں کہاں استاد
کس کو روؤں؟ گلہ کروں کس کا؟ | گردشِ بخت، یہ چرخ کی بیداد
کس سے اصلاح لوں؟ کسے ڈھونڈھوں | کون ایسا ملے گا اب استاد
کھینچتے تھے سخن کی وہ تصویر | تھے خجل جس سے مانی و بہزاد
روزمرہ، محاورہ بندی | تھا یہ مخصوص جوہرِ استاد
خالقِ معنی و خدائے سخن | اُن سے تھا ملکِ شاعری آباد
حضرتِ داغ سے تلمذ تھا | اور اپنے زمانے کے استاد
اُن کی ہر بات قابلِ تقلید | اُن کا ہر لفظ قابلِ اسناد
شعر دریا ہے اک سلاست کا | اور بندش ہے قلعۂ فولاد
شعر گوئی میں رہ گیا میں خام | ہونے پائی نہ کچھ بھی استعداد
رہ گئی دل کی آرزو دل میں | ہونے پائی نہ کچھ بھی استعداد
خاص مجھ پر بہت عنایت تھی | یاد آتی ہے شفقتِ استاد
چھپنے پایا نہ اُن کا دیواں حیف | رہ گئی ہائے حسرتِ استاد
شاید اس واسطے جہاں سے گئے | تھی عدم میں ضرورتِ استاد
اہلِ دنیا کو اُن کا ماتم ہے | خلد والے ہوئے مگر دل شاد
خاک میں مل گئیں امیدیں سب | حوصلے دل کے ہو گئے برباد
اُن کی رحلت سے ہی جہاں ویراں | اُن کے قدموں سے خلد ہے آباد

ہائے کیونکر کلیم ہو تاریخ
ہے جگر دوز رحلتِ استاد
۱۳۵۹ھ

حضرت احسنؔ کے اخلاق و عادات

(از محمد مقبول الکریم صاحب صدیقی
ایم اے (علیگ) - جبل پور)

حضرت احسنؔ سے مجھے پہلی بار ۱۹۲۰ء میں شرف نیاز حاصل ہوا۔ آپ کسی تقریب سے حیدرآباد تشریف لے جا رہے تھے۔ اخی المعظم جناب منشی محمد محفوظ الکریم صاحب کلیمؔ مدظلہ کے سخت اصرار پر راستے میں آپ نے چار روز غریب خانہ پر قیام فرما کر ہم لوگوں کی عزت افزائی فرمائی۔ بھائی صاحب قبلہ کو آپ سے ۱۹۱۱ء میں فخر تلمذ حاصل ہوا۔ چنانچہ بھائی صاحب معظم سے ابتداً بسلسلۂ شعر و شاعری تعارف ہوا اور خط و کتابت جاری ہوئی۔ لیکن حضرت نے اپنے خلوص و محبت کی بنا پر جو قدرت نے آپ کی طبیعت میں ودیعت کئے تھے تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کی جانب ایسی توجہ مبذول فرمائی کہ یہ تعلقات جن کا آغاز ایک خاص وجہ سے ہوا تھا محض ذاتی محبت اور بزرگانہ شفقت میں جن کے لئے سوائے صفائی قلب کے اور کسی وجہ کی ضرورت نہیں مبدل ہو گئے۔

بھائی صاحب مکرم کے توسط سے حضرت سے پہلے میرا غائبانہ تعارف ہوا لیکن آپ نے صرف بھائی صاحب کی محبت کی وجہ سے اس خاکسار کے حال پر اس قدر لطف و کرم فرمایا کہ بھائی صاحب محترم کے نام کا کوئی ایسا خط نہ ہوتا تھا جس میں اس ناچیز کو آپ یاد نہ فرماتے ہوں۔

بھائی صاحب قبلہ کی حضرت سے پہلی ملاقات مارہرہ میں ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ سن مذکورہ میں جناب کے فرزند رشید محمد احسنؔ صاحب کی شادی جو آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اسسٹنٹ رجسٹرار کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں قرار پائی۔ حضرت نے بھائی صاحب معظم کو بھی باصرار تمام مارہرہ اس تقریب سعید میں شرکت کے لئے یاد فرمایا۔

بھائی صاحب پہلے ہی سے حضرت کی قدمبوسی کے متمنی تھے لہٰذا اس موقعہ کو غنیمت جانکر

تقریب میں تشریف لے گئے۔ گو بھائی صاحب سے یہ پہلی ہی ملاقات تھی لیکن حضرت آن سے اسس شفقت و مہربانی سے پیش آئے کہ گویا نہایت دیرینہ مراسم ہیں۔ اس کے قبل جب بھائی صاحب مدظلہٗ کو حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کا موقعہ نہیں ملا تھا انھوں نے حضرت سے اُنکی فوٹو طلب فرمائی۔ آپ نے از راہِ کرم اپنی فوٹو بھیجی۔ اُس کے ہمراہ یہ شعر بھی لکھ کر بھیج دیا ؎

اپنی تصویر کی قسمت پر حسنؔ ہے رشک
وہ منگائی گئی لیکن میں بلایا نہ گیا

ظاہر ہے کہ اس شعر سے کس قدر جذبۂ محبت مترشح ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں میں نے بی،اے، کی تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا جس وقت میں قدمبوسی کے لئے حضرت کے دولت کدہ پر پہونچا۔ آپ نے بے حد خوشی کا اظہار فرمایا اور فرط مسرت سے گلے لگالیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک نہایت محبت اور شفقت سے گفتگو فرماتے رہے۔ بھائی صاحب قبلہ کی خیریت دریافت فرمائی اور دیگر معاملات کے متعلق بات چیت ہوتی رہی جب حضرت نے بھائی صاحب معظم کو میری ملاقات کی اطلاع دی تو نہایت محبت آمیز لہجہ میں تحریر فرمایا کہ "آج آپ کے بھائی سے کیا ملاقات ہوئی گویا آپ سے گفتگو ہوئی ایسی اُنس ومحبت کی مثالیں اب شاذ و نادر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محبت وخلوص کے پیکر مجسم تھے۔

علی گڑھ میں تعلیم کے سلسلہ میں میرا تین سال قیام رہا۔ حضرت اُس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کالج میں جو اُس وقت یونیورسٹی میں شامل نہ تھا اُردو کے لیکچرار تھے۔ اور چونکہ میں یونیورسٹی میں تھا اس لئے آپ کی تعلیم و تدریس سے بہرہ اندوز نہ ہوسکا۔ اس کو میں اپنی شومئی قسمت کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کرسکتا ہوں۔ لیکن علی گڑھ کے دوران قیام میں وقتاً فوقتاً حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ وہاں اکثر علمی چرچے ہوتے رہتے تھے چنانچہ میں حضرت کی دلچسپ اور پُرمغز ادبی مسائل پر گفتگو سے لطف اندوز ہوتا اور اس وقت کو اپنی زندگی کے نہایت قیمتی لمحات تصور کرتا ہوں۔ علی گڑھ میں جب کبھی مجھے کوئی مشکل پیش آئی ہمیشہ بلا تکلف آپ کی خدمت

میں حاضر ہوکر مشورہ اور امداد کا طالب ہوا۔ آپ نے نہایت خندہ پیشانی سے حتی الامکان امداد فرمائی جس سے بسا اوقات مجھے فوائد پہونچے۔ آپ کے اِن نوازشات اور احسانات نے میرے قلب پر اس قدر گہرا اثر کیا کہ انشا راللہ تازیست انھیں فراموش نہ کروں گا۔

حضرت کی خوش خلقی متانت اور سنجیدگی بھی ضرب المثل تھی۔ تین سال کے عرصہ میں جب تک مجھے حضرت کی خدمت بابرکت میں حاضر ہونے کا فخر رہا میں نے کبھی آپ کی پیشانی پر شکن نہیں دیکھے۔ اور چھوٹا ہو یا بڑا، ملازم ہو یا آقا، دوست ہو یا عزیز، شاگرد ہو یا اُستاد آپنے کبھی کسی سے ترشروئی سے گفتگو نہیں کی۔ اُستاد کی حیثیت سے آپ اپنے شاگردوں سے ہمیشہ نہایت نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ کالج کے باہر بھی اگر کوئی شاگرد علمی امداد کا طالب ہوا تو آپ نے کبھی اُس کو مایوس نہیں فرمایا بلکہ نہایت محبت و الفت سے اُس کی خواہش کو پورا کیا۔ یہی سلوک آپ کا اُن شاگردوں کے ساتھ رہا جن کو آپ سے شعرو شاعری کے باعث لگاؤ تھا۔ بارہا میرے مشاہدہ میں آیا کہ اگر بھائی صاحب معظم نے کوئی غزل یا تاریخ اصلاح کی غرض سے حضرت کی خدمت میں بھیجی اور اگر کسی ضرورت سے اُس کی فوراً واپسی کے لئے استدعا کی تو ہمیشہ آپ نے خط پہونچتے ہی اصلاح فرماکر فوراً اُسے واپس کردیا۔ مزید برآں آپ نے کبھی اصلاح کا معاوضہ طلب نہیں کیا۔ اور نہایت خوشی اور توجہ سے اصلاح فرمائی آجکل شعرا میں ایسے بے لوث اُستاد بہت کم نظر آتے ہیں بلکہ اکثر نے تو شاعری کو پیشہ قرار دے رکھا ہے اور جب تک ان کی خدمت میں معاوضہ پیش نہ کیا جائے ہرگز اصلاح نہیں فرماتے۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت احسن اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک بے نظیر شخصیت کے مالک تھے اور جس شخص کو آپ سے اگر ایک مرتبہ بھی کسی سلسلے میں ملاقات کا اتفاق ہوا وہ آپ کا ایسا گرویدہ ہوا کہ ہمیشہ آپکی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسے شفیق اور مہربان بزرگ بہت کم دستیاب ہوتے ہیں اور حضرت احسنؒ کا ہمارے درمیان سے اُٹھ جانا ایک ایسا نقصان ہے جو ناقابل تلافی ہے۔ خدا آپکو جنت میں مقام اعلیٰ مرحمت فرمائے اور آپکے پسماندگان کو آپکے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت احسن کا املاء

از غلام مصطفیٰ خاں۔ ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)
کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار)

ہر شایستہ زبان کے لئے سب سے پہلے قواعد کا ہونا ضروری ہے اُس کے بعد ادبا خود ہی دوسری خامیوں کو دور کر دیتے ہیں اور زبان کو معیاری بلندی پر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں قواعدِ زبان کے ساتھ ساتھ اصلاحِ املاء کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مقلّدین بغیر تحقیق کئے ہوئے کہیں کے کہیں نہ پہونچ جائیں۔

اُردو زبان میں غالباً سب سے پہلے شخص انشاء ہیں جنہوں نے (۱۸۰۸ء میں) قواعد زبان اور اصلاحِ املاء کی طرف خاص توجّہ فرمائی اور املاء کے چند اصول قائم کئے جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) انشاء فرماتے ہیں: "کبھی امر حاضر مفرد پر ہمزہ اور یائے مجہول زیادہ کرکے جمع بناتے ہیں جیسے اُٹھئے، کبھی ہمزہ سے پہلے جیم مکسور بھی (فعل متعدی میں) بڑھاتے ہیں جیسے کیجئے، لیجئے، دیجئے، ..... (لیکن یہاں) جیم (وغیرہ) کے بعد ہمزہ کا حذف ...... جائز بلکہ زیادہ فصیح ہے۔" [۱]

انشاء کے اس قول کو ٹھنڈے دل سے سمجھئے تو معلوم ہوگا کہ کیجئے، لیجئے، دیجئے وغیرہ کے آخر جزو میں یائے مجہول پر جو لوگ ہمزہ لگا دیتے ہیں وہ بے شک بالکل غیر موزوں ہے۔ کیوں کہ ہمزہ اور یے کا تلفظ "اے" ہوگا "یے" نہیں ہو سکتا جو کہ مطلوب ہے۔

(۲) پھر انشاء فرماتے ہیں "ایدھر[۲]، کیدھر، اودھر (اوس وغیرہ کو) کتابت میں ضمّے کی رعایت سے واو اور کسرے کی رعایت سے ی لکھ دیتے ہیں اور بعضے نہیں لکھتے۔ صحیح وہ ہیں جو نہیں

---

[۱] دریائے لطافت، انجمن ترقی اُردو صفحہ ۲۰۰-۲۰۱۔

[۲] لفظ "ایدھر" اور فارسی "ایدر" میں دراصل توافقِ لسانین ہے۔ فردوسی اور تمام متقدمین کے یہاں یہ لفظ مل سکتا ہے۔ سید حسن غزنوی (م ۵۵۵ھ ۱۱۶۰ء) کے یہاں بھی ہے:- ناورد دیگر چو منے در ہزار سال سا ینک تو ایدری فلکا و من آیدرم۔

لکھتے۔ کیونکہ اگر ترکی کے قاعدے کے مطابق حرفِ مضموم کے بعد وآو اور حرف مکسور کے بعد یَ لکھنا ضروری ہے تو حرفِ مفتوح کے بعد الف بھی لکھنا چاہیئے۔ (لیکن) ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ رہا، کہا، چلا کو (ترکی کی طرح) راہا، کاہا، چالا (اردو میں) نہیں لکھتے (تو پھر بلا وجہ) اُردو میں ترکی کی ٹانگ توڑنے کے کیا معنی ؟۔ (اسی طرح) لفظ "اِس" (اشارۂ قریب) میں یاء نہیں لکھتے۔ (حالانکہ لفظ 'اُس' میں واو لکھتے ہیں۔" اِس بیچارے نے کیا قصور کیا ہے کہ بغیر یاء کے لکھتے ہیں۔ لفظ 'اِدھر' میں جو یاء نہیں لکھتے اُس کی وجہ یہی ہے کہ حرکت کے بعد حرف بڑھانا ضرور نہیں۔ اِس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ اُس اور ایسے تمام اُردو لفظوں میں جس میں ضمہ بغیر وآو کے آواز دیتا ہے وآو کا لکھنا صحیح نہیں۔ ایسا ہی حال یَ کا ہے۔ جس حرف کے بعد تلفظ میں اسکا اظہار ہو تو کتابت میں بھی درست ہے۔ ورنہ غلط۔۔۔۔۔"[۴]

انشاء کے اِس اجتہاد کے باوجود ہمارے شعراء اور ادباء اسی ڈھرّے پر رہے۔ پھر کچھ التفات کیا اور یَ کو حذف کر کے صرف زیر کی حرکت پر اکتفا کیا۔ لیکن پیش کی حرکت کے بجائے وآو کا لکھنا امیر اور داغ جیسے مصلحِ زبان شعراء کے یہاں بھی قائم رہا۔

(۳) سیّد انشاء نے تیسری بات یہ بتائی کہ جن ضمائر کے بعد "ہی" مستعمل ہوتا ہے وہاں ہی کو مستقل جزو کے بجائے اِدغام کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"'اُنھیں سے'، اصل میں 'اُن ہی سے' ہے۔ لیکن اب نقل کا استعمال اصل سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔۔۔"[۵]

(۴) چوتھی بات انشاء کے نزدیک یہ ہے کہ جس لفظ کے آخر میں الف (یا ہ) ہو اور اُس کے

---

[۳] کاتب کی کتابت کہیئے یا رنگین کی بدعت کہ دیوان میں مولانا رحمٰن علی صاحب مرحوم کے کتاب خانے میں ایجادِ رنگین (قلمی) میں ایک شعر یہ ہے جس میں "ایسے" کے بجائے "ایسے" ہے:-

دل اے رنگین ایسے اب دیجئے کیا ۔۔۔ الغرض اپنا بھی ہے کچھ مدّعا

[۴] دریائے لطافت صفحہ ۲۲۶-۲۲۹ [۵] ایضاً صفحہ ۳۰۶۔

بعد (مضاف کی طرح) حروف جارہ، فاعلیت، مفعولیت اور اضافت کی حالت میں آئیں تو وہ الف ریا ہ) یے سے بدل جاتا ہے اور یہ تبدیلی دراصل متغیرات میں داخل نہیں۔ ۶
اور ایک جگہ انشا اپنے مفرد و جمع کے بیان سے صاف ظاہر کر دیتے ہیں کہ اردو الفاظ کے آخر میں ہ کے بجائے الف ہی ہونا چاہیئے۔ مثلاً پیڑا، کیلا، کھرا، اندرسا، چیتا، پپیہا وغیرہ کو وہ الف ہی سے لکھتے ہیں۔ ۷

غرض سید انشا، املا کے سب سے پہلے مُصلح تھے۔ اُن کے بعد لیکن اُنھیں کے عہد میں فورٹ ولیم کالج والوں نے بھی اُردو املا کی طرف کچھ توجہ فرمائی۔ اور (۱) معروف و مجہول ی کے استعمال میں آج جو امتیاز ہے وہ انھیں لوگوں کی کوشش سے ہے۔ ۸ حال آں کہ دہلی کی طرف یہ چیز غالب کے زمانے تک بھی نہ پہنچ سکی تھی۔ (۲) دوسری اصلاح انھوں نے یہ کی کہ گول ہ اور دوچشمی ھ میں بھی امتیاز پیدا کیا اور مؤخر الذکر کو صرف مخلوطی حالت میں رائج کیا۔ ورنہ حقیقت ہے کہ "بندہ" اور "بندھ"، "دہل" اور "دھل" کی کتابت میں کوئی فرق ہی نہ تھا۔ ۹

انشا کے بعد غالب نے املا کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ چنانچہ ایسے اشارے اُنکے بعض خطوط میں بھی پائے جاتے ہیں۔ منشی بہاری لال مشتاق کو لکھتے ہیں: "یہ تقلید اور انشا پردازوں کے، تمہاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو جا بجا آگاہ کرتا ہوں۔ خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ بالکل زائل ہو جائے۔" ۔ ایک اور جگہ غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں کہ "صاحب۔ تم نے مثنوی خوب لکھی ہے۔ کہیں املا، کہیں انشا میں جو اغلاط تھے دور کئے اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے تحت میں لکھ دی۔" (اردوئے معلّی۔ صفحہ ۲۳۸ و صفحہ ۱۲۱) چنانچہ غالب

نمبر ۶۔ دریائے لطافت صفحہ ۳۰۶۔
نمبر ۷۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۳۶۔
نمبر ۸۔ اب بھی بعض پرانے بزرگ یائے معروف و مجہول میں فرق نہیں رکھتے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ "میری چھوٹی لڑکی باہر گئی ہوئی ہیں"۔ جس سے مراد تھی کہ "میرے چھوٹے لڑکے باہر گئے ہوئے ہیں"۔
نمبر ۹۔ رسالہ "ہندوستانی"، جولائی ۱۹۳۸ء۔ صفحہ ۳۴۵۔

نے بھی بعض اصلاحیں قائم کیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) وہ ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے کہ گزشتن، گزر، پزیر وغیرہ فارسی الفاظ میں زے کے بجائے ذال کا استعمال ہو۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ ذال دراصل عربی حرف ہے جو فارسی میں نہیں آتا۔ غالب کی اس تاکید کے متعلق مولانا حالی نے بھی یادگار غالب میں ذکر کیا ہے۔ غالب کا یہ قول صحیح ہے لیکن قدیم فارسی کے بعض الفاظ میں ذال کا استعمال دیکھ کر آج کل بعض بزرگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فارسی میں بھی ذال ہے اور اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی عربی اور معرب کے متعلق ابھی تک پوری تحقیق نہیں ہوئی۔

(۲) دوسری اصلاح یہ ہے جو انشا کے زمانے سے بھی تھی مگر غالب نے بہت پابندی کے ساتھ برتی۔ یعنی ان کا "اصول یہ تھا اور صحیح تھا کہ جن لفظوں کی اصل فارسی یا عربی نہیں اُن میں مختفی ہ نہیں آسکتی۔ الف ہونا چاہیئے۔ بلکہ فارسی کے لفظ بھی جب اُردو محاورے میں آئیں تو اُن کو الف سے لکھنا چاہیئے۔ جیسے:۔ اور مزا یہ کہ ......" عا

(۳) تیسری اصلاح جس کے لئے غالب بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے وہ یائے تحتانی کے متعلق ہے۔ چنانچہ میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:۔ "صاحب، دیکھو۔ پھر تم ڈنگا کرتے ہو۔ ...... غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟۔ یاد رکھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے۔ (۱) جزو کلمہ: ع ہمائے بر سر مرغاں ازاں شرف دارد۔ مثل اس کے جہاں یائے تحتانی جزو کلمہ ہے اُس پر ہمزہ لکھنا، عقل کو گالی دینا ہے۔ .... دوسری یائے تحتانی، مضاف ہے۔ حرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے۔ جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے تو شوم، رہنمائے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ تیسری دو طرح پر ہے:۔ یا مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح، توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہوگی۔ مصدری کی مثال آشنائی۔

عا رسالہ "ہندوستانی" جولائی ۳۰ء صفحہ ۳۶۵۔

یہاں ہمزہ ضرور ۔ بلکہ نہ لکھنا ، عقل کا قصور توحیدی (کی مثال) آشنائے ۔ یعنی ایک آشنا ، یا کوئی آشنا ۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھوگے وانہ نہ کہاؤگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خستہ ، لستہ ، غازہ ، خانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ ہزار لفظ ہیں کہ اُن کے آگے جب یائے توحید آتی ہے تو اس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں (اسی طرح) زرہ ، گرہ ، کلاہ ، شاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے الفاظ کے آگے اگر تحتانی آتی ہے تو زرہی ، گرہی ، کلاہی ، شاہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لکھ دیتے ہیں ۔ ،، [11]

(۴) چوتھی خصوصیت غالب کے املا کی یہ تھی کہ وہ لفظ ہاتھ کو اکثر و بیشتر ہات لکھتے تھے ۔ اور اُسکا قافیہ " بات " ، " رات " وغیرہ کے ساتھ باندھتے تھے ۔ پھر بھی " ساتھ " کو ہا کے ساتھ لکھتے تھے بہرحال ان لفظوں کے صرف جواز کے متعلق اُن کا فتویٰ تھا ۔ مولانا حالی بھی اپنے ایک خط میں قبلہ نواب صدر یار جنگ علامہ حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کو لکھتے ہیں " جنابِ من ' لفظ ہاتھ میں بلاشبہ ہائے مخلوط ہے ۔ لیکن رات اور بات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے ۔ قافیے کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فروگزاشتوں کو جائز کر دیتی ہے ۔ مرزا غالب کبھی اور کسی کی جگہ کبھو اور کسو کو بھی غیر فصیح سمجھتے تھے ۔ لیکن اُن کے اُردو دیوان میں قافیے کی جگہ کسو اور کبھو بندھا ہوا ہے ۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں مگر قافیے میں ہات باندھنا جائز سمجھتا ہوں ۔ ۔ ۔ ،، [12]

انشا اور غالب کے بعد فصیح الملک حضرت داغ دہلوی نے اصلاح فرمائی ۔ لیکن چونکہ نثر میں اُن کی کوئی تصنیف نہیں ہے اس لئے اُن کے دواوین سے مستقل طور پر جن الفاظ کا املا پایا جاتا ہے اور جس پر استاذی حضرت احسن مارہروی ہمیشہ عمل کرتے تھے اُن کا بیان اب شروع ہوتا ہے ۔ اور یہی دراصل اس مضمون کا مقصد ہے ۔

حضرت داغ دہلوی کے شاگردوں میں آغا شاعر دہلوی نے اپنے استاد کی پوری اور

---

[11] اردوئے معلیٰ ۔ صفحہ ۲۷۳ ۔ ۲۷۴

[12] تاریخ نثر اُردو (از حضرت احسن) صفحہ ۵۵ ۔

تیکھے پن کو قائم رکھا، حضرت نوح ناروی نے اُن کے موسیقیت آمیز توازن کو لے لیا۔ جناب سائل اور سیماب نے اُن کی زبان و محاورات کی پابندی رکھی لیکن حضرت احسن مارہرویؒ کی شان دوسری تھی۔ وہ شاعر بھی تھے، محقق بھی تھے، بقولِ اکبر الٰہ آبادی، علم عروض کے ائمہ میں بھی شامل تھے، قواعدِ زبان کے کاملین میں سے تھے اور وہ سب کچھ تھے جیساکہ اُردو ادب کے ایک مستجمع الکمالات بزرگ کو ہونا چاہئیے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بزرگ استاد کی شاعری کو ہر اعتبار سے پرکھا اور انکی ہر خوبی کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ ان خوبیوں میں املا بھی شامل ہے جس کے وہ عامل تھے اور جو کہ مذکورہ بالا املائی اصلاحات کے علاوہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) لفظ "ہی" کو جب ضمیر کا آخری جزو بنایا جائے تو واحد غائب میں "وہ ہی" اور "یہ ہی" کے بجائے ہمیشہ "وہی" اور "یہی" ہی استعمال کیا جائے۔ یہ چیز پہلے بھی تھی لیکن اب مستقل طور پر رائج کی گئی اور جب ضمیر، جمع غائب اور جمع متکلم ہو تو "اُن ہی" اور "ہم ہی" کے بجائے "انھیں، اُنھیں" اور "ہمیں۔ ہمیں" ۱۳ لکھنے لگے۔ اسی طرح جمع حاضر کے لئے "تم ہی" کے بجائے تمہیں اور تمھیں بھی لکھا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چیز آتش کے یہاں بھی تھی لیکن جیساکہ ہم پڑھ چکے ہیں وہ اسے صرف بہتر سمجھتے تھے۔ غالب کے یہاں بھی تھی۔ مثلاً:۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے ۔۔۔ تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اور وہ بھی "ہی" کا مختلف استعمال رکھتے تھے:۔

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی ۔۔۔ تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

لیکن داغ اور تلامذۂ داغ نے جب انھیں، تمھیں، ہمیں، وہی، یہی لکھا تو پھر کبھی اُن ہی۔ تم ہی۔ ہم ہی، وہ ہی، یہ ہی نہیں لکھا۔

---

۱۳ صرف جلال لکھنوی نے "میں ہی" کے بجائے "مہیں" رائج کیا۔ ؎ جلایا کئے وہ شبِ وصل میں۔ مہیں رات بھر شمع محفل رہا (جلال)
لیکن ان کے شاگردوں میں یہ لفظ اب ختم ہو گیا۔

ایک لفظ "یوں ہی" سے "یونہیں" بنا یا جو حضرت احسن کے علاوہ دوسرے تلامذہ کے یہاں بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ ورنہ ابھی تک غالب کی روش قائم ہے:-

یوہیں دکھ کسی کو دینا، نہیں خوب، ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی (غالب)

حضرت احسن نے ہمیشہ نثر و نظم میں اسے "یونہیں" ہی لکھا۔

(۲) دوسری اصلاح وہی تھی جس کی موافقت سب سے پہلے انشا نے کی تھی اور جس "غلطیِ جمہور" میں غالب بھی شریک تھے[۱۴۷] یعنی دیکھیئے، دیجیئے، چاہیئے وغیرہ الفاظ میں یائے مجہول سے پہلے ہمزہ کا حذف۔ اب یہی روش مشاہیر ادبا کی ہے۔ عام لوگ ضرور ہمزہ لکھتے ہیں۔

(۳) انشا اور غالب کی طرح لیکن ان کی بہ نسبت زیادہ سختی کے ساتھ داغ نے یہ بات رائج کی کہ ہندی لفظوں میں مختفی ہ نہیں لکھنا چاہیئے بلکہ الف ہی ہونا چاہیئے۔ حضرت احسن نے رسالہ فصیح الملک میں اس پر بہت بحث کی اور ہمیشہ اس پر عمل کیا۔ چناں چہ ان کی تحریر میں ہمیشہ اور ہر جگہ پتا، بھروسا، سامنا، دھوکا وغیرہ الف ہی سے پائیں گے۔ اسی طرح غیر ہندی الفاظ جن میں غلطی سے ہ کی پچھاڑی لگا دی جاتی ہے وہ اُن کی تحریروں میں ہمیشہ الف سے ہیں۔ مثلاً حلوا، تماشا، تقاضا، تمغا، ناشتا، معمّا وغیرہ۔

(۴) چوتھی اصلاح وہی ہے جس کی جھلک انشا کے زمانے سے موجود تھی یعنی ہائے مختفی کو حالت رسالہ یائے تحتانی سے لکھا جائے۔ جیسے "ایک زمانے میں" "اس پردے کا" وغیرہ۔ اور یہ بالکل مناسب روش ہے۔ کیونکہ ہم لوگ الف اور مختفی ہ کا تلفظ ایک جیسا کرتے ہیں۔ تو جب ہم "ایک بچڑا میں" اور "ایک لڑکا کا" نہیں بولتے تو پھر "ایک زمانے میں" اور "اس پردے کا" بولنے میں کیا قباحت ہے؟۔ حضرت احسن عموماً تلفظ کی رعایت رکھتے تھے اسی لئے "روپیے" نہیں بلکہ "رپے"

---

[۱۴۷] رسالہ "ہندستانی" جلد ۴۔ صفحہ ۹۴ ۔ کے بعد کا عکس (الف) ۔ سطر ۱۲۔

لکھتے تھے۔

(۵) مرکب لفظوں کو حضرت احسن ہمیشہ اصل اجزا کے ساتھ الگ الگ لکھتے تھے۔ خواہ وہ ہندی کے ہوں، خواہ فارسی کے۔ مثلاً کیوں کہ، کون سی، اس واسطے کہ، اس لئے چناں چہ، چوں کہ، حال آں کہ، دل چسپ، دل کش، دل آویز، ہم سر، ہم عمر، کم یاب، دست یاب، خوب صورت، مفت بر، پیش رو۔ وغیرہ۔

ان کے علاوہ کچھ اور الفاظ ایسے تھے جن پر انھوں نے فصیح الملک میں مفصل بحث کی ہے اور کچھ ایسے تھے جن کی صحت پر تاکید کی تھی جیسے روحِ رواں کو روح و رواں، دائم المریض کو دائم المرض کہنا ہی صحیح سمجھتے تھے۔ لفظ ایجاد کو ہمیشہ اہلِ دہلی کی طرح مذکر لکھتے تھے یہ بحث تاریخ نثر اردو صفحہ ۲۵۶-۲۵۹ میں دیکھنی چاہیئے۔

غرض کہ املا کے متعلق اتنا مسالا موجود ہو گیا تھا جس کی مدد سے انجمن ترقی اردو نے ۱۹۲۳ء میں اس کے لئے اصول قائم کئے جن کی تفصیل رسالہ "اردو" (اکتوبر ۲۳ء) میں موجود ہے۔

احسن کی موت پر

از محمد سعید خاں سعید نجیب آبادی

وہ داغِ جگر رحلتِ احسن نے دیا ہے | ہر انجمنِ علم وادب بزمِ عزا ہے
الحاج بھی حافظ بھی تھے سید بھی تھے احسن | شاعر بھی تھے اور عالمِ جید بھی تھے احسن
ہے ظلم کہ معدوم ہو وہ علم کا دریا | اُردو کے لئے جس کا وجود آبِ بقا تھا
محتاجِ بیاں اس کے نہیں کارِ نمایاں | جو خود فلکِ علم کا ہو مہرِ درخشاں
تعلیم کی تقدیس نمایاں تھی انہیں سے | ہاں شمعِ ادب آج فروزاں تھی انہیں سے
سید نے بنا ڈالی تھی جس علم وادب کی | احسن نے یہاں آکے اسے اور جلا دی
کیں بزمِ دبستاں میں نئی طرز سے خدمات | ہر درس سے ظاہر تھی نئی چیز نئی بات
تحقیق بھی یکتا تھی مبصر بھی تھے کامل | تاریخ بھی شاہد ہے یہ دعوی نہیں باطل
اشعار میں دلچسپ تھی رنگین بیانی | رنگین بیانوں میں محبت کی کہانی
اشعار کے ساغر میں مئے عشق پلائی | جو دل کی کمائی تھی سرِ بزم لٹائی
وہ مردِ خدا منبعِ فیض آج کہاں ہے | اے بزمِ ادب تیرا وہ سرتاج کہاں ہے
تھے رونقِ گلزارِ سخن حضرتِ احسن | افسوس ہوا نذرِ خزاں آج یہ گلشن

سن کر خبرِ مرگ ندا دل سے یہ آئی
"احسن نے دیا وائے ہمیں داغِ جدائی"

۱۳۵۹ھ

رِویو

(از حضرت احسن مارہروی)

نوایم خامہ و لفظ است لشکر
بمیداں آمدم اللہ اکبر

میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس لئے انگریزی خواں ناظرین سے امید ہے کہ وہ معاف فرمائیں گے اگر اس لفظ کے معنی بتانے میں انگریزی انسائیکلو پیڈیا کی تحقیق کے مطابق کوئی کمی یا غلطی رہ جائے۔ میں رِویو کو عربی لفظ تقریظ کا مترادف سمجھے ہوئے ہوں، ممکن تھا کہ اس مضمون کے عنوان میں رِویو کی جگہ تقریظ کا لفظ لکھا جاتا۔ مگر چوں کہ یہ لفظ (رِویو) بہت زیادہ مشہور ہو گیا ہے اور نیز اس لفظ کے پڑھتے ہی وہی مفہوم خیال میں آتا ہے جس کے لئے یہ لفظ موضوع ہوا ہے۔ اس واسطے یہی عنوان مناسب معلوم ہوا۔ ورنہ تقریظ کا آئینہ قدیمی عمل درآمد کی وجہ سے یک رُخی تصویر دکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اکثر ایسی کتابوں میں جن کے مؤلف و مصنف پرانے مذاق کے بزرگ ہوتے ہیں قطعات تاریخی کے ساتھ سلسلۂ تقاریظ بھی دیکھا جاتا ہے۔ ایسے مضامین لکھنے والوں کا یہ عام اصول ہو گیا ہے کہ بغیر دیکھے بھالے کتاب کی اشاعت سے پہلے تقریظیں تحریر فرماتے ہیں۔ جن میں زیادہ تر بلکہ بالکل مصنف و تصنیف کی تعریف ہی ہوتی ہے۔ جب سے انگریزی عمل داری ہوئی اور سررشتۂ تعلیم کے ذریعے سے مغربی مذاق عام ہوا اُس وقت سے من جملہ اَور اسماء والفاظ کے اُردو زبان میں یہ لفظ بھی بولا جانے لگا۔ انگریزی خواں اہل قلم کی یہ توجہ قابل شکریہ ہے کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مضامین میں اس لفظ کا صحیح مفہوم ادا کر کے عرف عام میں تقریظ کا ہم ردیف نہ ہونے دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ردیو یا تقریظ کی اصلی غایت یہی ہے۔ کہ کسی کتاب یا مضمون پر

ریویو لکھنے والا صحیح رائے ظاہر کرے اور اس تصنیف کے تمام عیب وصواب بغیر کسی ذاتی رعایت اور تعصب کے سنائے۔ یہ غلطی اور بڑی بھاری غلطی ہے اگر کوئی مصنف اپنی کتاب کی غلطیاں سُن کر بُرا مانے۔ کوئی فرد لبشر یقینی طور سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو تحقیق وتصنیف میں کر رہا ہوں وہ ہر شخص کی نظر میں مقبول ہو جائے گی۔ یا اس میں کسی قسم کی فرد گزاشت نہ ہوئی ہو گی۔ غلطی لبشریت ہے اور اُس کی اطلاع پر بُرا ماننا حیوانیت مگر افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ آج کل ابنائے زمانہ میں خود بینی کا ایسا مادّہ پیدا ہو گیا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا کام اپنی رائے غرض اپنی ہر چیز ہر حالت میں اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اور اگر ایسا سمجھنا اپنی ہی ذات تک محدود رہے تو بھی چنداں مضائقہ نہیں کہ اُس کا اثر بظاہر دوسروں پر نہیں پڑتا مگر زیادہ افسوس تو اس کا ہے کہ اپنی خود بینی یا خود ستائی اپنے ہی تک نہیں رکھی جاتی بل کہ لفظاً معناً کسی نہ کسی طریقے سے دوسروں پر ظاہر کر کے اپنے منھ میاں مٹھو بننا پسند کیا جاتا ہے۔ یہ خود بینی اور خود ستائی نہیں تو کیا ہے کہ اگر فصیح الملک کی کسی صریحی غلطی یا فرو گزاشت پر کسی انصاف پسند مہربان نے کوئی رائے ظاہر کی اور اتفاق سے وہ میرے خلاف ہوئی تو اب میں فضول نزاعِ لفظی کر کے پاس سخن کر رہا ہوں کیا ہرج ہو اور کیا میری ذات میں بٹّا لگ جائے اگر کسی دوست کے بتائے ہوئے نیک مشورے پر عمل کیا جائے یا کسی کی بتائی ہوئی غلطی سے متنبّہ ہو کر آئندہ کے لئے احتیاط کی جائے۔ اُن چند پاکیزہ نفوس کو چھوڑ کر جنھیں خدا نے اچھی باتوں کی توفیق دی ہے فی زمانہ عام طور سے کوئی مصنف کوئی مؤلف کوئی شاعر کوئی اسپیکر کوئی واعظ غرض کوئی ہنر در پسند نہیں کرتا کہ میرے کاموں پر کسی قسم کا واجبی اعتراض کیا جائے۔ افسوس۔

ہو گیا خود بیں ہر اک آئینہ گر
یہ ہنر بھی عیب سے خالی نہیں

میرے نزدیک اور نہ صرف میرے نزدیک بل کہ ہر ایک ذی ہوش وانصاف پسند

کے خیال میں کوئی کام اور ایسا کام جس کا اثر ایک سے زیادہ لوگوں پر پڑتا ہو بغیر اصلاح و ترمیم اور مشورے کے انجام نہیں پا سکتا اگر اس کے خلاف کوئی مثال کسی کے پاس ہو تو فرمائی جائے۔ (. . . . .)

قبل اس کے کہ اخباری اُردو پر رائے زنی شروع کی جائے یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اُردو زبان کی عام حالت کا اندازہ کیا جائے کہ یہ ایک زبان تمام ہندوستان میں کس شان کس ترکیب اور کن طریقوں سے بولی جاتی ہے۔ قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے والے یہ بات دلچسپی سے پڑھیں گے کہ وہی ایک اُردو زبان جس کو تمام اہل ہند یا کم از کم وہاں کے باشندے جن کا نقشہ ہر مہینے مخزن کے ٹائٹل پیج پر ہوتا ہے۔ بولتے رہتے ہیں اور جس کو سطحی نظر رکھنے والے ایک ہی زبان سمجھتے ہیں مگر جب نگاہ غور سے دیکھا جاتا ہے تو عالم۔ واعظ۔ اسپیکر۔ شاعر۔ وکیل۔ بیرسٹر۔ غرض ہر فرقے کی طرز گفتگو ایک دوسرے سے جدا پائی جاتی ہے۔ جس ایک مطلب کو عالم و فاضل اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ رنگ شعرا میں نہیں ہوتا۔ جو الفاظ شعرا صفائی اور شستگی سے کہہ جاتے ہیں وہ دوسروں کے ہاں ڈھونڈے نہیں ملتے۔ اُردو کی لاتعداد نیرنگیاں دیکھ کر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جتنے منہ اُتنی زبانیں۔ اس بیان کی توضیح کے لئے اس موقع پر مکرمی جناب شاہزادہ مرزا محمد عبدالغنی صاحب گورگانی حضرت ارشد دہلوی کی اُس تقریظ لطیف کا خلاصہ لکھا جاتا ہے جو موصوف نے فرہنگ آصفیہ کے واسطے تحریر فرمائی تھی۔ اس تقریظ میں مرزا صاحب موصوف نے اپنی جدّت پسند اور قابل طبیعت سے آج کل کی اُردو کے اقسام قائم کرکے سب کے جدا جدا نام رکھے ہیں جو نہایت دلچسپ اور مفید ہیں۔ وہی ہذہ۔

"اُردو زبان جو آج کل قریباً تمام ہند کی بولی سمجھی جاتی ہے اپنی قدیمی بناوٹ کے لحاظ سے شاہجہانی نہیں رہی تاہم نئی اشاعت اور سجاوٹ کے سبب جہاں گیری مزاج اور عالم گیری تورہ رکھتی ہے۔ جہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو ترقی کرکے ہزاروں کو کیا لاکھوں

کو آگئی ہے وہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لاکھوں کو کیا ہزاروں کو بھی نہیں آئی ؎

آنچہ بر جستیم دیدم کم کہ بسیار است و نیست
نیست جز اُردو دریں عالم کہ بسیار است و نیست

یہی سبب ہے کہ اُردو کے اقسام۔ اُردو کا رنگ ایسا بدل گیا ہے کہ اب شاہ جہانی ریختہ بنیاد از پا ریختہ ہوگیا۔ زبان حال کی اُردو کے اقسام کا جمع کرنا محال ہے۔ صرف ہم اپنی رائے میں بطریق فرض محال بارہ قسمیں مقرر کرتے ہیں جن میں لطیفہ یہ ہے کہ جس طرح برس کے دن بارہ مہینوں پر تقسیم ہیں اسی طرح اُردو کی ترقی و تنزل کا میلان ہر روز ہر ماہ بارہ طرح سے ہوسکتا ہے۔ چوں کہ اُردو کا مخزن و مخرج شاہ جہاں آباد ہے اس لئے دہلی ہی ان تقسیموں کی بنیاد ہے۔

اقسام زبانِ اردو

(۱) وہ اُردو جو دہلی کے شرفا کی زبان ہے۔ اہل زبان نے اسے وفور فصاحت اور نور سلاست سے مجلّٰی کیا ہے۔ اس لئے اس کا نام اُردوئے معلّٰی ہے۔

(۲) وہ اُردو جو لکھنؤ کے عماید و سخن ور بولتے ہیں۔ چونکہ زیادتی تکلّف نے اس میں گہرا رنگ دیا ہے۔ اس لئے اس کا نام اُردوئے مطلّا ہے۔ ان دونوں قسموں میں وہ نسبت ہے جو آفتابِ درخشاں اور ماہتابِ تاباں میں یا باپ اور ماں میں۔

(۳) وہ اُردو جو عالم و فاضل لائق و کامل بولتے ہیں۔ اس میں لغت کی بوچھاڑ بڑے بڑے الفاظ کے پہاڑ ہیں۔ اور اس کے واسطے لغت اور فرہنگ کی سخت ضرورت ہے اس لئے اس کا نام فرہنگی اُردو ہے۔

(۴) وہ اُردو ہے جس پر اخبارات کی حکم رانی ہے۔ اس میں اُردو میں اڈیٹوریل نوٹس کا رنگ جدا ہے اور کارسپانڈنٹوں کا ڈھنگ جدا۔ اس لئے اس کا نام خود رنگی۔

اُردو ہے۔

(۵) وہ اُردو ہے جو پنچ اخباروں کا روزمرہ ہے اُس کی طرز غایت شوخی و نہایت ظرافت بسیار ہی ہزل کثرتِ خرافت کے سبب قیودِ زبان آوری سے آزاد ہے اس کا نام ہڑدنگی[1] اُردو ہے۔

(۶) وہ اُردو جو صاحبان انگریز بولتے ہیں اور اُن کی دیکھا دیکھی ہندی عیسائیوں نے چھاونیوں کے سوداگروں نے انگریزوں کے کم رتبہ نوکروں نے۔ اس قسم کی مشق بہم پہنچائی ہے اس کا نام فرنگی اُردو ہے۔

(۷) وہ اُردو جو لکھنؤ اور دہلی کے آکا بھائی لٹرنت کے شائق۔ بانڈے بازی میں فائق علم سے دور خوش طبعی سے معمور باہم بولتے ہیں۔ اس میں ضلع جگت۔ پھبتی۔ دشنام۔ وغیرہ شامل ہیں اس کا نام لفنگی[2] اُردو ہے۔

(۸) وہ اُردو جو ریل کے بابو انگریزی داں بولتے ہیں اس میں زمین[3] تو انگریزی لفظوں کی ہے اور پیٹ[4] اُردو کی ہے اس کا نام بے ڈھنگی اُردو ہے۔

(۹) وہ اُردو جو ناول نویس ڈراما لکھنے والوں نے اختیار کی ہے اس کا نام خود آہنگی[5] اردو ہے۔

(۱۰) وہ اُردو جو اَن پڑھ فقیر بھنگیں پی کر چرس کا دم لگا کر کبھی عالم لاہوت پر جھونپڑی لگاتے ہیں اور کبھی عالم ناسوت پر بڑھیا گُداتے ہیں اور اپنے زعم فاسد میں معرفت الٰہی کا دم بھرتے ہیں۔ نشے کی غایت اور کمال ذوق وشوق کی حالت میں کچھ اَن گھڑ فقرے کچھ بیہودہ

---

[1] وہ عورت جو آزادی سے ہر جگہ پھرتی ہے ۱۲۔

[2] جس میں لُچا پن ہو ۱۲۔

[3] عطر سازی کی اصطلاح ہے ۱۲۔

[4] عطر سازی کی اصطلاح ہے ۱۲۔

[5] اپنے خیال کے مطابق ۱۲۔

اشعار بناتے اور سناتے ہیں اس کا نام سوبھنگی اُردو ہے ۔[1]

(۱۱) وہ اُردو جو مناظرہ کرنے والے ۔ کسی کی ہجو لکھنے والے ۔ کام میں لاتے ہیں اس میں ایسے دو پہلو الفاظ بولتے ہیں جن کی آڑ میں وہ لائبل کیس سے بری ہو جائیں اور فی الحقیقت مخاطب کی آبرو جاتی رہے اس کا نام جنگی اُردو ہے ۔

(۱۲) یہ اُردو بڑی قیامت خیز فتنہ انگیز اُردو ہے ع پارہ خواہد شد ازیں دست گریبانے چند
اس اُردو کی ایسی مثال ہے جیسے پورب میں اِدھر بھادوں کا مہینا آیا اُدھر شوقینوں کو کنھیا جی کے جنم کی خوشی نے گرمایا ولادت سے پہلے کرتا ۔ ٹوپی ۔ ہنسلی ۔ کڑے ۔ تیار ہو گئے ۔ اگرچہ یہ اُردو ابھی پیدا نہیں ہوئی مگر اس کا خیمہ ڈیرا پورب میں آگیا ہے ۔ لکھنے کے حروف بڑی شدّ و مد سے تراشے جا رہے ہیں وہ زمانہ قریب ہے کہ خود بدولت براجیں ۔ چوں کہ بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ گھسیٹ گھسیٹ کر اس میں ڈالے جائیں گے اور دیگر زبانوں کے لغت کھینچ کھینچ کر باہر نکالے جائیں گے ۔ قدیمی اُردو داں اس تازہ اُردو کو پورا نہ لکھ سکیں گے نہ بول سکیں گے ناچار سرزنش اُٹھانی پڑے گی اس واسطے قبل از ظہور بطور تفاءل اس کا نام سرجنگی اُردو ہے[2]۔"

خلاصہ یہ کہ اُردو کے اقسام جہاں تک بنائے جائیں قیامت تک بنے جائیں گے اور آخر کار کسر متوالیہ کی طرح کسر ہی رہے گی "

اس تفصیل و تشریح سے غرض یہ ہے کہ عموماً تمام اُردو بولنے والوں کی اور خصوصاً اہل تالیف و تصنیف خواہ وہ بحیثیت اخبار ہو یا بصورت رسائل سب کی ایک زبان ہونی چاہیے جس کا نام اُردوئے معلّٰی ہے اور جو دہلی و لکھنؤ کی زبان ہے ۔ مجھے یہ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ لکھنؤ کی زبان اُردوئے معلّٰی کے سوا کوئی دوسری نئی زبان ہے ۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مکرمی حضرت ارشد نے

---

[1] لامذہبا اور آزاد مذہب فقیر ۱۲ ۔

[2] جیت ۔ دھول ۔ دھپّا ۱۲ ۔

لکھنؤ کی زبان کو اُردوئے معلّا کسی نکتہ چینی کے خیال سے نہیں کہا ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو اپنے بیان میں وہاں کی زبان کو اُردو کے وجود کا باعث سمجھ کر باپ یا ماں نہ بناتے۔

بعض توسیعِ زبان کے دل دادہ یہ ضرور فرمائیں گے کہ وسعت زبان کے لئے کسی خاص جگہ کی قید عام اس سے کہ وہ دلّی ہو یا لکھنؤ نہ ہونی چاہیئے۔ بل کہ تمام ہندوستان کی اُردو خواہ وہ اکثر اور شائستہ حصّۂ ملک میں اجنبی کیوں نہ ہو رائج ہونی چاہیئے۔ اس خیال کا جواب نہایت معقول اور مدلّل موجود ہے مگر بخوف طوالت یہاں اُس کا بیان غیر ضروری ہے اس لئے مختصراً یہ گزارش ہے کہ ہر ایک کام کی اچھائی برائی یا حُسن و قبح معلوم کرنے کے لئے کسی نہ کسی معیار یا خاص انتظام کی ضرورت ہے۔ اگر اُردو زبان کی فصاحت و سلاست کا انحصار دلّی اور لکھنؤ پر نہ ہوا تو مندرجۂ ذیل دونوں فقرے (جن کا مفہوم تو ایک ہے مگر طرز بیان مختلف) کوئی امتیازی فرق ظاہر نہیں کر سکتے مثلاً (۱) عن قریب اُردو بھی علمی زبان ہونے والی ہے (۲) بہت جلد اُردو کی زبان علم کی زبان ہو جاوے گی غالباً اس تشریح کی ضرورت نہیں کہ فقرہ نمبر (۲) کتنا فصیح اور سلیس واقع ہوا ہے۔ علاوہ اس کے ابھی یہی مشکل ہے کہ صرف دلّی لکھنؤ ہی میں زبانی اتفاق و اتحاد ہو کر وہ تمام پرانے اور فضول جھگڑے (جو نہایت ہی محدود ہیں) مٹ جائیں جنھوں نے عام لوگوں میں بے کار خیالات پھیلا رکھے ہیں۔

بہر حال اس سلسلۂ تقریظ میں جو کچھ تنقید و تحقیق کی جائے گی وہ دلّی لکھنؤ کی زبان کے قواعد و اصول و استعمال کی بنا پر ہوگی۔

آخر میں پھر بعجز، تمام اڈیٹرانِ اخبار اور مہتممانِ رسالجات سے استدعا ہے کہ وہ اس رد و نمبر کو اوّل سے آخر تک ملاحظہ فرمائیں اور نیاز مند کی ہر رائے جو محض بغرض استفادہ ظاہر کی جائے گی مخلصانہ خیال فرما کر اگر کوئی رائے یا عرض قابل قبول ہوا اور وہ شبہ یا اعتراض غائد تھا۔ تو اپنی ہمت خوش اخلاقی سے کام لے کر بے تکلف ظاہر فرمائیں۔ اور اگر کوئی رائے غلط ہو تو اس سے متنبہ کریں۔

پنجاب

اس ہونہار بل کہ کام یاب صوبے کی اخباری شہرت محتاجِ تشریح نہیں۔ واقعی نہایت کام یابی اور استقلال سے یہاں کے اکثر اخبار نکلتے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ضروری اصلاح و ترمیم کا مفید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کوئی رسالہ کوئی اخبار اُردو کے سوا کسی دوسری ہندوستانی زبان میں نہیں پایا جاتا۔ اور اگر ہوگا تو اس کے جاننے والے اُتنے ہی نکلیں گے جتنے اُس اخبار کے کالم یا صفحے۔

کچھ دنوں سے پنجاب کی اخباری زبان پر ممالک متحدہ کے بعض اخبار مختلف قسم کی رائیں ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ ہم کو اُن سے کوئی تعرض نہیں۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پنجاب کے لوگ جس طرح اپنے ہر تجارتی کام میں نہایت محنت وجاں فشانی سے داد کارگذاری دیتے ہیں اسی طرح وہ اخباری کاروبار میں تمام ہندوستانی اخباروں پر سبقت پانے کے مستحق ہیں۔ زبان کی بابت بھی بغیر کسی تردد کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل پنجاب اس میں بھی معقول ترقی کر چکے ہیں اور آئے دن آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

کیا یہ تعجب و حیرت کی بات نہیں کہ ہر ایک پنجابی اڈیٹر اپنی چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سی بڑی ضرورت کے لئے ہر وقت پنجابی زبان بولتا رہتا ہے جس کو سن کر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُردو بھی جانتا ہے مگر جب قلم کی زبان اُسی اڈیٹر کے ہات سے متحرک ہوتی ہے اُس وقت اُردو کا لشکر پرا جمائے اپنے کمانڈران چیف (اڈیٹر) کے حکم کا منتظر رہتا ہے۔ جس کے اشارے پر ہر ایک حرف اور لفظ سوار اور پیادے کی طرح اپنی اپنی جگہ جم جاتا ہے۔

پنجابی اڈیٹر ایک وقت اور ایک سانس میں دو مختلف بولیاں اس طرح بولتا ہے کہ ایک کا اثر زبان دہن سے سننے والوں کے دلوں پر پڑتا ہے اور دوسری زبان کاغذ پر

فی النقش کا لجز ہو جاتی ہے اب اگر ایسی حالت میں کوئی غلطی یا کسی قسم کی فروگزاشت کسی عبارت میں ہو جائے تو تعجب کی بات نہیں ۔

اپنے پنجابی معاصرین سے بعجز یہ عرض ہے کہ جہاں تک اتنی محنت و توجہ سے وہ اُردو زبان میں کام کرتے ہیں وہاں تھوڑی سی تکلیف صحتِ الفاظ کے لئے اور گوارا کریں اور اسی طرح ممالک متحدہ کے مبصرین سے استدعا ہے کہ وہ کسی کی حرف گیری اس طرح نہ کریں جو دل شکنی کا باعث ہو۔ میں کسی پنجابی اڈیٹر میں یہ مادہ نہیں پاتا کہ اگر اُس کے سامنے معقولیت سے کوئی بات پیش کی جائے تو وہ اس کا نامعقول جواب دے۔ اسی وجہ سے میری یہ ہمت ہوئی کہ میں ذیل کے الفاظ اہل پنجاب کے سامنے پیش کر کے التجا کروں کہ وہ ان پر نظر انصاف ڈالیں۔ اور فرمائیں کہ یہ الفاظ اُردو ترکیب میں ابتدائے اُردو سے اب تک کہیں بولے جاتے ہیں یا نہیں۔ اُردو کی صحیح ترکیب وہی ہے جس کو سب سے پہلے اہل دہلی و لکھنؤ اور ساتھ ہی اُن کے تمام صوبوں کے قابل شعرا اور فاضل محققین مانتے اور بولتے ہوں۔ اب وہ الفاظ اور فقرے لکھے جاتے ہیں جو پنجابی اخباروں میں دیکھے جاتے ہیں۔

	پنجابی اخباروں کے بعض الفاظ یا فقرے	مشتبہ لفظ حرف	مترادف اور صحیح الفاظ یا فقرے
۱۔	بمعہ	ب	مع
۲۔	ہم نے کھانا تھا	نے	ہمیں یا ہم کو کھانا تھا
۳۔	اغلباً	الف قبل (غ)	غالباً
۴۔	اس نے کچھ زیور پہنا ہوا تھا	نے	وہ کچھ زیور پہنے ہوئے تھا
۵۔	نہ یہ کام کیا نہ ہی وہ	ہی	نہ یہ کام کیا نہ وہ

۶-	دن بدن	ب	روز بروز۔ رات دن
۷-	واقع بھی یہی ہے	واقع بھی	واقعی یہی ہے
۸-	آہم	آ	اہم
۹-	چند ایک	ایک	چند
۱۰-	جنازہ پڑھنا	ترکیب موجودہ	جنازہ کی نماز پڑھنی یا پڑھنا
۱۱-	زلزلے کا جھٹکا آیا یا دھکا	جھٹکا یا دھکا	زلزلہ آیا
۱۲-	اُن کو لائق استادوں نے لکھایا گیا تھا۔	گیا	اُنھیں لائق استادوں نے لکھایا تھا
۱۳-	طاعون آئی	آئی،	طاعون آیا

یہ الفاظ نہایت سرسری نظر سے انتخاب کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے سوا اور مشتبہ الفاظ ہوں اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ان لفظوں میں دو فقرے ایسے ہیں جن پر شاید اہل پنجاب کچھ بحث فرمایں۔ یعنی جنازہ پڑھنا اور زلزلے کا جھٹکا۔ اس کا نہایت مختصر اور مسکت جواب یہ ہے کہ ۴۔ اپریل ۱۹۰۵ء سے قبل زلزلے کے جھٹکے کا اثر پنجاب میں بھی نہیں تھا۔ چہ جائے کہ اور کہیں۔ بہر حال ان دونوں لفظوں کی سند میں دتی لکھنؤ کی کوئی تحریر دکھائے بغیر ان کا استعمال نہ صرف مشتبہ ہے۔ بل کہ خلاف محاورہ اور غلط سمجھا جائے گا۔ پنجاب کے متعلق فی الحال اور کچھ لکھنا نہیں ہے اس سے دوسری طرف نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

ممالک متحدہ

یہاں کے اخبار بالعموم زبان کی موٹی موٹی اور معمولی غلطیوں سے پاک ہیں۔ مگر بعض اڈیٹروں کی بے توجہی اور سہل انکاری سے اکثر فقرات ایسے بھی دیکھنے میں آجاتے ہیں جو قطعاً خلاف فصاحت ہونے کے سوا صحیح بھی نہیں ہوتے بطور نمونہ دو چار فقرے اس وقت

پیش کئے جاتے ہیں۔

نمبر شمار	غیر فصیح یا غلط	غلط لفظ	فصیح و صحیح
۱-	بھیجد یویں	یویں	بھیج دیں
۲-	قانون گویان و پٹواریوں کی	یان و	قانون گویوں اور پٹواریوں کی
۳-	اِن چار میں سے بھی دو ایسے ہیں	سے	اِن چار میں بھی دو ایسے ہیں۔
۴-	گرڑھنا	ہ (بعد ڑ)	گھڑنا

عموماً ممالک متحدہ آگرہ او دھ کے عام باشندے اور خصوصاً اہل دہلی و لکھنؤ صاحب زبان بننے کے مدعی اور صحیح مدعی ہیں مگر افسوس ہے کہ باوجود ادعائے زباں دانی بے پروائی سے کام لے کر اپنی وقعت کھوتے ہیں۔ امید ہے کہ اس معمولی نوٹ پر پوری توجہ کی جائیگی۔

مدراس و حیدرآباد دکن

حیدرآباد کی عام اور کاروباری زبان کی بھی وہی حالت ہے جس طرح پنجاب کی وہاں بھی لکھنؤ دہلی جیسی اُردو نہیں بولی جاتی۔ البتہ پنجاب سے اتنا فرق ضرور ہے کہ وہاں کے عام و خاص بولتے اُردو ہیں۔ اگرچہ فقرے فقرے اور جملے جملے میں نکو اور ہا دکا حاشیہ چڑہاتے جاتے ہیں۔ پنجاب اور حیدرآباد دکن کی عام گفتگو میں ایک نئی اور عجیب بات دیکھی جاتی ہے۔ یعنی اگر پنجابی اور حیدرآبادی پڑھے لکھوں سے اُردو کے حروف ہجا پڑھوائے جائیں تو صحیح تلفظ کے ساتھ تمام حرف پڑھ جائیں گے۔ مگر روز مرّہ اور عام گفتگو کے وقت پنجابی (ق) کو (ک) بولتے ہیں۔ جیسے کوم (قوم کی جگہ) اور اہل دکن ق کو (خ) اور خ کو (ق) سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً قادم بجائے خادم اور خرار بجائے قرار۔

اثنائے قیام حیدرآباد میں حضرت استادی نواب فصیح الملک مغفور نے ایک مرتبہ یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دن کسی حیدرآبادی رئیس کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں جلسۂ رقص و سرود ہو رہا تھا۔ اسی جلسے میں ایک طوائف گلزار داغ کی غزل گا رہی تھی جس کا مطلع اس طرح اس نے پڑھا ؎

جھوٹی خسم (قسم) سے آپ کا ایمان تو گیا　　قاطر (خاطر) سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا

میں نے بچشم خود بعض معمولی لوگوں کی تحریر میں خاکسار کو (قاکسار) لکھا ہوا دیکھا ہے۔ مگر بایں ہمہ حیدرآباد کے عام اخباروں اور رسالوں میں کوئی غلیظ اور بھاری غلطی نہیں پائی جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ بجز دو ایک رسالوں کے (مثل دبدبۂ آصفی۔ دکن ریویو) اور اخباروں کی زبان دل چسپ یا زیادہ فصیح نہیں ہوتی۔ حیدرآباد کی دفتری زبان ۱۳۰۱ ہجری تک فارسی تھی اس کا اثر اب تک یہ باقی ہے کہ بعض بعض غیر مستعمل اور اجنبی الفاظ وہاں کے اخباروں میں لکھے دیکھے جاتے ہیں۔ پھر بھی امید ہے کہ اگر حیدرآبادی اڈیٹر کوشش کرتے رہے تو اُن کی زبان معمولی توجہ سے سلیس و فصیح اور صحیح ہو سکتی ہے۔ حسب ذیل الفاظ و فقرات قابل توجہ ہیں۔

نمبر شمار	مروجہ الفاظ	غلط لفظ	فصیح الفاظ
۱-	پہنچا دے سکتے ہیں	دے	پہنچا سکتے ہیں
۲-	اندھیرا ہوئے جاتا ہے	ہوئے	اندھیرا ہوا جاتا ہے
۳-	آٹھ بجے چاہتے ہیں	بجے	آٹھ بجا چاہتے ہیں
۴-	بحسبِ بیان	ب	حسب بیان
۵-	بہت سارے ہوتے ہیں	سارے	بہت سے ہوتے ہیں

نمبر شمار	مروّجہ الفاظ	غلط لفظ	فصیح الفاظ
۶۔	نقل کرائے سکتے ہیں	کرائے	نقل لے سکتے ہیں
۷۔	میں خط روانہ کیا ہوں	میں ہوں	میں نے خط روانہ کیا ہے

عام اخباروں کی غلط کتابت

مذکورہ بالا لفظی غلطیوں کے سوا جو خاص خاص صوبوں میں پائی جاتی ہیں بکثرت ایسے الفاظ ہر صوبے میں پائے جاتے ہیں جن کی کتابت بالکل غلط ہوتی ہے اور اس کا رواج کچھ ایسا عام ہو گیا ہے کہ بجز معدودے چند قابلوں کے (وہ بھی نجی تحریروں میں) ہر کتاب ہر تصنیف ہر اخبار اور رسالے میں موجود ہے۔ فصیح الملک کے ناظرین کہیں یہ شبہ نہ فرمائیں کہ یہاں وہ الفاظ لکھے جائیں گے جن کا التزام فصیح الملک میں ہے بل کہ وہ الفاظ لکھے جاتے ہیں جن کی مروّجہ کتابت بقاعدہ رسم الخط قطعاً ناجائز اور مکروہ ہے ملاحظہ ہو۔

نمبر شمار	مروّجہ کتابت	غلط حرف	صحیح املا
۱۔	اژدہام	ژ۔ ہ	ازدحام
۲۔	فی زمانہ	ہ	فی زمانا
۳۔	کلیجہ	ہ	کلیجا
۴۔	مہینہ	ہ	مہینا
۵۔	سینکڑوں	ن بعد س	سیکڑوں
۶۔	جھونٹ	ن	جھوٹ

نمبر شمار	مروّجہ کتابت	غلط حرف	صحیح املا
۷-	لاو بالی	و	لاآبالی
۸-	سو یچ	ل	سوتچ
۹-	فطرتاً	تاً	فطرۃً
۱۰-	قدرتاً	تاً	قدرۃً
۱۱-	ضرورتاً	تاً	ضرورۃً
۱۲-	دفعتاً	تاً	دفعتہً
۱۳-	مقابلتاً	"	مقابلتہً
۱۴-	نسبتاً	"	نسبتہً
۱۵-	اندازاً	"	اندازہ
۱۶-	دونو	نو	دونوں
۱۷-	معناً	اً	معنےً
۱۸-	گڈھ	ڈہ	گڑھ
۱۹-	معمّہ	ّ	معمہ
۲۰-	بےپرواہ	ہ	بےپروا
۲۱-	پتہ	"	پتا
۲۲-	عش عش	ع	اش اش
۲۳-	عبیر گلال	"	ابیر گلال
۲۴-	گذرنا۔گذارش گذشتن۔گاذر	ذ	گزرنا۔گزارش۔گزشتن۔گازر

ان کے علاوہ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو غلط معنوں میں مستعمل ہیں اور بعض ایسے بھی

ہیں جن کا وجود لغت میں نہیں۔ مثلاً مشکور (بجائے شاکر یا ممنون) یہ لفظ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ کوئی نجی تحریر بھی اس سے خالی نہیں ہوتی۔ حالاں کہ فاعل کے معنی میں بالکل غلط ہے۔ اسی طرح بے ماں باپ والے کو یتیم و یسیر کہا جاتا ہے حالاں کہ یسیر بمعنی قلیل ہے۔ ایزاد یہ لفظ زیادتی کے معنی میں غلط مشہور ہو گیا ہے۔ یہی حال تشکیل کا ہے۔ جو وجیہ کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ الفاظ بھی سرسری انتخاب میں تلاش کئے گئے ہیں ان کے سوا اور الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جو پایۂ صحت سے گرے ہوئے ہیں۔ معزز ناظرین اور موقر معاصرین سے امید توجہ ہے۔ نیاز مند احسن کی سعی مشکور ہو اگر اتنے ہی پیش کردہ الفاظ صحت و خصوصیت کے ساتھ عام لوگوں میں درجۂ قبول حاصل کر لیں۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

(از رسالہ فصیح الملک بابت ماہ اگست ۱۹۰۵ء)

احسن مارہروی

اعجاز صدیقی (از شاعر بابت نومبر ۴۰ء)

کس نے پھینکا دوش سے ہستی کا یہ بارِ گراں — کس کا ماتم کر رہی ہے ہستیٔ ناشادماں
کس نے ٹھکرا دی حیاتِ چند روزہ کی متاع — آج کس کو رو رہے ہیں مل کے سب پیر و جواں
توڑ ڈالا کس نے گھبرا کر یہ سازِ زندگی — محفلِ ہستی کا ہر ذرہ ہے کیوں نوحہ کناں

کس نے خوابِ نیستی کی اوڑھ لی کالی ردا
کہتے کہتے رازِ ہستی رک گئی کس کی زباں

آہ اے ناکام قسمت، آہ اے ہندوستاں — ہیں ادب کی سوگواری پر تیرے آنسو رواں
شاعر و عشرت کا تھا پہلے ہی سے تو ماتمی — چھن گیا اک اور تجھ سے شاعرِ شیوہ بیاں
ایسا شاعر تھا فصیح الملک کو بھی جو عزیز — ایسا شاعر ناز فرما جس پہ تھی اردو زباں
ایسا شاعر جس نے خدمت کی ادب کی عمر بھر — ایسا شاعر تھا جو بزمِ شعر کی روحِ رواں
ایسا شاعر تھا فصاحت میں جسے حاصل کمال — ایسا شاعر جس نے سلجھائی تھیں فنی گتھیاں
ایسا شاعر جو نکاتِ شعر سے آگاہ تھا — ایسا شاعر جس سے زندہ تھی سلف کی داستا
ایسا شاعر بول یکسر جس کے تھے قند و نبات — ایسا شاعر کہنہ رنگِ شعر تھا جس سے جواں
ایسا شاعر جس سے اک دنیا نے کسبِ فن کیا — ایسا شاعر جو زبان و شعر کا تھا پاسباں
ایسا شاعر تھا جو حامی سادگیٔ شعر کا — ایسا شاعر مستند مانی گئی جس کی زباں
ایسا شاعر جس کی خودداری تھی مشہورِ انام — ایسا شاعر شاعری تھی جس کی رنگیں گلستاں

ایسا شاعر صلح کل مشرب تھا جس کا دہر میں
ایسا شاعر جو رہا ہر دلعزیزِ دوستاں

السلام اے شاعرِ رنگیں نوا، جادو بیاں — تجھ پہ ہے نوحہ کناں ہر شاعرِ ہندوستاں
بزمِ شعر و شاعری تجھ کو بھلا سکتی نہیں — ہو گئی ہے یاد اس درجہ تری دل میں نہاں

کہہ دو اے اعجاز آنسو روک کر سالِ وفات
زیبِ مرقد احسن مارہروی خلد آشیاں
۱۹۴۰ء

"جو بولو وہ لکھو"

آج کل انھیں الفاظ میں اُردو کتابت پر اعتراض کیا جاتا ہے جو ایک حد تک صحیح ہے کہ جسطرح جو لفظ بولا جائے حتی الامکان اُسی طرح لکھا جائے۔ عام اطلاع کے لئے چند الفاظ بتائے جاتے ہیں جن کا لحاظ عموماً بہت کم کیا جاتا ہے۔ نون کا تلفظ اُردو میں دو طرح ہے۔ جو نون آخر لفظ میں ظاہر کرکے پڑھا جائے وہ نقطہ دار ہے جیسے جان، تان اور جو اس طرح ظاہر نہ ہو اُس میں نقطہ نہ ہوگا۔ جیسے یہاں، کہاں، درمیانِ لفظ میں اگر نون با لاظہار ہو تو اُس پر معمولاً صرف نقطہ ہوگا۔ جیسے تنکا اور اگر بالاعلان نہ ہو تو اُس پر نقطے کے بجائے یہ نشان (ں) ہوگا جیسے تانبا +

یائے معروف و مجہول کا لحاظ تو عام طور پر کیا جاتا ہے مگر یائے ماقبل مفتوح کی کتابت کوئی خاص نہیں اُس کے لئے نصف دائرہ مناسب ہے۔ جیسے ئے ہے۔

ہائے مخلوط ہمارے نزدیک حرف وہی ہے جو ہجّوں میں اپنے اوّل و آخر حروف سے ملے جیسے ابھی۔ بھان۔ اس کی کتابت دو چشمی ہے (ھ) سے ہوگی۔ باقی ہر لفظ میں ایک ایک شوشے سے لکھی جائے گی جیسے کہیں۔ کچہ۔ آنکہ۔ جگہ۔ ہو وغیرہ۔ جو الفاظ الگ الگ لکھے جانے میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے اور جن کی ترکیب بھی دو جداگانہ الفاظ سے ہے اکثر جدا جدا لکھے جائیں گے جیسے "آئیں گے" "ہوں گے" "جس کی" "آپس میں" "غرض کہ" "بل کہ" "کیوں کہ" "علاحدہ حالتِ اضافت وعطف میں بھی فارسی الفاظ اسی طرح لکھے جائیں گے جس طرح بولے جاتے ہیں جیسے لب و لہجے" "اہلِ زبان" وغیرہ۔ اس وقت یہی مختصر اطلاع کافی ہے آیندہ جو ترسیم و اضافہ ہوگا وہ وقتاً فوقتاً ظاہر کیا جائے گا۔

احسن مارہروی

(از رسالہ فصیح الملک بابت مئی ۱۹۰۵ء)

مولانا احسن پر ایک اجمالی نظر

از سید الحسن متعلم فرسٹ ایر کلاس
مسلم یونیورسٹی

حضرت احسن مارہروی کا اصلی نام سید شاہ علی احسن تھا۔ آپ سید شاہ برکت اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اورنگ زیب کے زمانہ میں مارہرہ تشریف لائے تھے۔ آپ کی ولادت ۱۸۶۶ء میں بمقام مارہرہ ہوئی۔ حضرت احسن شروع ہی سے بہت ذہین اور علم کے شوقین تھے۔ آپ نے بچپن سے فارسی۔ عربی اور اُردو کی تعلیم پائی تھی اور ان زبانوں میں اس قدر جلد ترقی کر گئے کہ آپ کا شمار زبان دانوں میں ہونے لگا۔

شاعری سے آپ کو بچپن ہی سے لگاؤ تھا اور چھوٹی موٹی نظمیں جب ہی سے لکھا کرتے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں آپ فصیح الملک حضرت داغ کے شاگرد ہوئے اور بذریعہ خط و کتابت ان سے اصلاح لینے لگے۔ داغ اپنے ہونہار شاگرد کی قابلیت۔ ذہنیت اور علمی ذوق کو فوراً سمجھ گئے اور انھوں نے ان کو یہ شعر لکھ کر بھیجا ؎

سید احسن جو مرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں
جن کو اللہ نے دی فکر رسا طبع رسا!

آپ کی شاعری کا یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ ۱۸۹۶ء میں شاہ میاں نے اپنی غزلیات کا ایک مجموعہ "ریاض سخن" کے نام سے شائع کیا اور اس کو نواب صاحب ٹونک کی خدمت میں پیش کر کے انعام اور داد تحسین حاصل کی اور اس کا نام نواب صاحب نے بجائے "ریاض سخن" کے "ریاض خلیل" رکھا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ اپنے شفیق استاد کی زیارت کے شوق میں حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے اور ان کی وفات سے تین سال قبل واپس آئے یہاں آکر آپ کا دل کچھ زیادہ نہ لگا اور ۱۹۰۵ء میں لاہور تشریف لے گئے۔ اور

لالہ سری رام۔ ایم۔ اے۔ کے ساتھ خمخانہ جاوید کے ادارہ میں کام کیا۔ اسی زمانہ میں حضرت احسن نے ایک ماہانہ رسالہ 'فصیح الملک' جاری کیا گو اس رسالہ میں مولانا کا اپنا ذاتی مفاد نہیں ہوا لیکن پھر بھی یہ ایک بڑی ادبی خدمت تھی جس کو آپ نے عرصہ دراز تک اپنے خرچ سے نہایت کوشش اور جانفشانی سے جاری رکھا۔ اس رسالہ میں آپ اپنے استاد داغ کی مرتب کی ہوئی لغت کو قسطوں میں بطور ضمیمہ شائع کرتے رہتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں اس رسالہ کے بند ہو جانے کے بعد آپ نے 'یادگار داغ' مرتب کی۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کے لکچرار مقرر ہوئے اور آپ کو اُردو زبان و ایک مسلم ادارہ دونوں کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک سترہ سال کے عرصہ میں آپ نے زبان کی بہت بڑی خدمت کی جس کو کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ نے یونیورسٹی کے کہنے پر ولی کا کلام جمع کر کے ایک دیوان کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اس کے علاوہ آپ نے اُردو نثر کی تاریخ لکھی ہے۔ آپ نے اس کتاب میں جگہ جگہ پر ادب القدما کی مثالیں پیش کی ہیں جن سے ہم کو پتہ چلتا ہے کہ پرانا لٹریچر کیا تھا اور مولانا نے اس کو ترتیب دینے میں کس قدر کاوش سے کام لیا ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہم کو اس کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ آپ نے مکاتیب داغ بھی جمع کرنے شروع کئے تھے۔ لیکن آپ کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ کام نامکمل رہ گیا۔ آپ جب تک یونیورسٹی میں رہے آپ کا مقصد ہمیشہ یہی رہا کہ طالب علموں اور تشنگان سخن کو آپ کی ذات سے فائدہ پہنچتا رہے اور ایسا ہی ہوا۔ آپ ہمیشہ طلبا میں سچائی حق پرستی اور علمیت کی روح پھونکتے رہتے تھے اور وہ بھی آپ سے بہت خوش تھے اور آپ کو ایک سچا ہمدرد اور مشفق استاد سمجھتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں آپ اپنی اس خدمت سے سبکدوش ہو کر مارہرہ تشریف لے گئے اور پھر وہیں رہے۔ یہاں آ کر بھی آپ کا سلسلہ شاعری و تصانیف جاری رہا۔

آپ کی شاعری میں قدیم اساتذہ کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا سوقیانہ یا مبتذل شعر نہیں پایا جاتا ہے۔ آپ کے خیالات میں رنگینی اور طرز بیان میں شیرینی پائی جاتی ہے مضامین باندھنے میں آپ ید طولی رکھتے ہیں۔ آپ کا اصول تھا کہ خواہ کتنا ہی اچھوتا مضمون ذہن میں آئے جب تک اچھے اور موزوں الفاظ نہ ملیں اس کو شعر کے سانچے میں نہ ڈھالنا چاہیے آپ بہت غور و فکر کر کے مناسب اور پاکیزہ الفاظ تلاش کرتے تھے پھر اپنے مضمون کو شعر کا جامہ پہناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کوئی شعر معیار سے گرنے نہیں پاتا تھا۔ ہر لفظ کی موزونیت کی وجہ سے شعر بھدا اور بد نما بھی نہیں ہونے پاتا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں الفاظ کی بھرمار نہیں ہے۔ ان کے الفاظ کی نشست اس قدر صحیح ہوتی ہے کہ ایک لفظ بھی گھٹانے بڑھانے سے وہ بے لطف ہو جاتا ہے۔ ان کے کلام میں کسی کو حرف گیری کا موقع نہیں مل سکتا۔

گو ان کا رنگ شاعری قدیم شعرا کا تھا لیکن پھر بھی ان کے دماغ میں جدید ذہنی جذبات بھی موجزن تھے جو اکثر موقعوں پر ان کے کلام میں جھلکتے ہیں۔ آپ کا ہر شعر کسی نہ کسی اچھے اور پاکیزہ اور صاف مضمون پر مشتمل ہوتا ہے اور اکثر اشعار میں رنگینی پائی جاتی ہے۔ مثال کے لئے ہم چند شعر درج کرتے ہیں۔

لوگ محفل میں تجھے اے عشوہ گر دیکھا کئے ۔۔۔ ہم الگ بیٹھے ہوئے سب کی نظر دیکھا کئے

توبہ سے لب بلب ہے پیالہ شراب کا ۔۔۔ گویا گناہ راہ نما ہے ثواب ... کا

تمہارے جانثاروں میں ہمیں کیا اک نرالے ہیں ۔۔۔ یہ جتنے جی رہے ہیں سب تمہیں پہ مرنے والے ہیں

جو رمز آگاہ الفت ہیں خموشی ہی خموشی میں ۔۔۔ بیان شوق سنتے ہیں بیان دل سمجھتے ہیں

کوئی دیکھے یہ تماشائے تکلف کب تک
ہو چکا پردہ بس اب آؤ ادھر دیکھ لیں

کلام میں تخیّل کی بلند پروازی حد درجہ کی پائی جاتی ہے ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہو ذکر غم کسی کا میں یہ سمجھ رہا ہوں　　دنیا مجھی سے میرا افسانہ کہہ رہی ہے

قیامت بھی اسی دن حسن اپنا سر اٹھائیگی　　ہماری سانس جس دن چلتے چلتے اک گھڑی ٹہر

مولانا کی زبان صاف اور ڈھلی ہوئی ٹکسالی زبان ہے الفاظ کی بندش بالکل برجستہ ہوتی ہے کہتے ہیں ؎

آ گئی کام نقاہت میں وسیع النظری　　ذرہ ذرہ رہ وحشت کا بیاباں نکلا

ایسے دیدار میں مزا کیا تھا　　نہ سُنا کچھ نہ کچھ کلام کیا

وصل کی شب کا انتظار نہ پوچھ
ہم نے مر مر کے دن تمام کیا

کبھی صیاد ہنس ہنس کے جو کرتا ہے گل افشانی　　قفس میں بھی بہار آشیاں معلوم ہوتی ہے

آپ کے اشعار اکثر موقعوں پر تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً ؎

یوں محو جمال اے رُخ جانانہ بنا دے　　یعنی مجھے اپنے سے بھی بیگانہ بنا دے

مجاز بنکے حقیقت سے آشنا ہوں میں　　نہ خود نما مجھے سمجھو خدا نما ہوں میں

اس کے علاوہ آپ کے اشعار تصنع سے پاک ہوتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی عروض کی غلطی کا امکان نہیں ہوتا ہے اس سے آپ کی شاعرانہ علمیت کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کو عروض پر کس قدر دستگاہ حاصل تھی۔ قواعد جاننے میں بھی آپ یکتا تھے اور صرفی و نحوی غلطیوں سے حتی الامکان اپنے کو دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

آپ کی نثر بھی اُردو ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے آپ کی کتابیں۔ مقدمات۔ مقالات اور مراسلات زبان کے لئے ایک بیش قیمت گنجینہ ہیں۔ آپ کا علم بے حد وسیع تھا اور آپ نے لاکھوں کتابیں پڑھی تھیں۔ آپ کو شاعری کے علاوہ قواعد۔ عروض اور املا میں بھی کافی دسترس حاصل تھی اور آپ ہر لفظ پر کافی بحث استدلال کے ساتھ کر سکتے تھے اور تقریباً ہر لفظ کی اصل اور اس کے آغاز اور استعمال سے واقف تھے طلبا نے آپ سے جب کبھی

کوئی سوال محض آپ کے امتحان کے لئے کیا تو بھی آپ نے برا نہ مانا اور اس کا معقول اور مدلل جواب دیا جس سے وہ آپ کی علمیت کے معتقد ہو گئے تھے۔

آپ کی نظر بہت وسیع اور حافظہ نہایت پختہ تھا اور آپ جو بحث کرتے تھے اپنے پر پورا اعتماد کر کے کرتے تھے۔ اشعار کا رنگ پہچاننے میں آپ کو خاص کمال حاصل تھا اور تقریباً اساتذہ کے کلام کا ہر شعر دیکھ کر یہ بتا سکتے تھے کہ یہ کس کا ہے اگر شاعر کا نام نہیں تو کم از کم اتنا تو ضرور بتا دیتے تھے کہ یہ کس دور اور کس کے زمانہ کا ہے گویا آپ ہر دور کے رنگ شاعری سے پوری طرح واقف تھے اگر آپ کسی لفظ کی اصلیت اور معنوں پر بحث کرتے تھے تو مختلف شعرا کے اشعار اس کی مثال میں پیش کر دیتے تھے اور یہی نہیں بلکہ جس زبان کا لفظ ہوتا تھا اسی زبان کے اشعار کا حوالہ آپ دیتے تھے اور اس لفظ کی کئی کئی ترکیبیں اور استعمال بھی بتا دیتے تھے۔ آپ کا املا اس قدر صحیح تھا کہ اکثر آپ کی بحث علما سے ہو جاتی تھی اور زیادہ تر آپ ہی کا املا درست ثابت ہوتا تھا۔

حضرت داغ کو احسن جیسے شاگرد پر ہمیشہ ناز رہا اور حق یہ ہے کہ آپ نے داغ کی وہ خدمات کیں ہیں کہ جن کے وہ خود معترف ہیں۔ داغ کا نام چمکانے میں زیادہ تر حصہ احسن کا ہی ہے۔ آپ نے ان کے کئی دیوان مرتب کئے اور اپنے استاد کا نام زندہ رکھنے کے لئے کئی مقدمے لکھے۔ داغ کی زندگی میں مولانا احسن ان کا بہت ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کی تمام اصلاحات حضرت احسن کے ہاتھ کی ہی لکھی ہوئی ہیں۔ جو کلام فصیح الملک کے پاس صحیح ہونے کو آتا تھا تو حضرت داغ محض اس کی اصلاح بدل دیا کرتے تھے اور احسن مرحوم اپنے قلم سے اس کو درج کر کے واپس کرتے تھے اور اکثر خطوط کا جواب بھی آپ ہی دیا کرتے تھے۔

کتب بینی کا شوق آپ کو بے حد تھا اور آپ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آپ نے ہزاروں ادیبوں اور شعرا کا کلام پڑھا تھا اور اپنے ذوق اور

خداداد حافظہ کی بنا پر ان سے بہت کچھ حاصل کیا تھا اور اسی مواد نے آپ کی ادبی زندگی میں ایک مشعل بن کر خضر راہ کا کام کیا۔ انھوں نے اپنے مکان میں ایک بہت بڑا کتب خانہ چھوڑا ہے جس میں طرح طرح کی ہزاروں کتابیں ہیں یہ کتب خانہ علم کے قدر دانوں کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے۔ *

اس کے علاوہ آپ کا رجحان مذہب کی طرف بھی بہت زیادہ تھا۔ آپ نے اسلام اور اس کے قوانین۔ فقہ اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ صوم وصلوٰۃ و دیگر احکام شریعت کے آپ بچپن ہی سے بہت پابند تھے۔ مساکین اور فقرا کو آپ کی ذات سے بہت فائدہ پہنچتا رہا۔ آپ سترّہ سال کی عمر میں حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ قرآن شریف آپ کو پورا حفظ تھا اور روزانہ اس کی تلاوت فرماتے تھے۔ آپ کا لہجہ اور قرأت اس قدر صحیح تھی کہ جو سنتا تھا تعریف کرتا تھا۔ آپ اکثر تمام رات عبادت الٰہی میں بسر کر دیتے تھے۔

آپ کا اخلاق بہت وسیع تھا۔ آپ کبھی کسی سے برے دل سے نہیں ملتے تھے اور ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی ان سے ناخوش نہ رہے آپ کی مہمان نوازی بہت مشہور ہے۔ مہمانوں کی مہمان نوازی اور خاطر داری آپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور کبھی کسی مہمان کو بغیر ٹھہرائے نہ جانے دیتے تھے۔ آپ کے دوست بھی بہت تھے اور آپ سب سے بہت خوش اخلاقی سے ملتے تھے۔ آپ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ہر قسم کی بناوٹ سے نفرت تھی۔ آپ بذلہ سنج بھی تھے اور مجلس میں احباب کو اپنی ظرافت اور خوش طبعی سے محظوظ کرتے تھے۔ اسلامی سیاسیات میں بھی آپ کو

---

* نوٹ:۔ ناظرین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مولانا احسن مارہروی مرحوم ومغفور کے ورثا نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق کتب خانہ احسن مسلم یونیورسٹی لائبریری کو دیدیا ہے جس کی وجہ سے طلبائے شعبۂ اردو کو استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملیگا اور مولانا مرحوم کی روح کو دائمی مسرت حاصل ہوگی۔ انشا اللہ تعالےٰ۔
"مدیر"

کافی دخل تھا۔ اور تقریباً ہر اسلامی سیاسی جماعت میں آپ حصّہ لیتے تھے اور نہایت خلوص اور جوش سے اس کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔

آخر عمر میں جب آپ آل انڈیا اُردو کانفرنس بریلی میں شرکت کرکے واپس ہوئے تو آپ کے پھنسیاں نکل آئیں اور رفتہ رفتہ یہی پھنسیاں مرض کاربنکل میں تبدیل ہوگئیں۔ کچھ عرصہ تک آپ علی گڑھ میں علاج کراتے رہے اور پھر اپنے صاحبزادے کے پاس پٹنہ تشریف لے گئے وہاں انھوں نے آپ کا علاج ریڈیم سے کیا لیکن چونکہ موت کا پیغام آچکا تھا۔ ۳۰ راگست سنہ ۱۹۴۰ء کو چھیاسٹھ ۶۶ سال کی عمر میں آپ کا طایر روح قفس عنصری کو چھوڑ کر جانب عالم بقا پرواز کر گیا آپ کی نعش مارہرہ لائی گئی اور قدیم قبرستان میں سپرد خاک کر دی گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن۔

پیشوائے سخنوری و سیّد الشعراء مولانا حضرت احسنؔ مارہروی مرحومؒ

(از مولانا کیفی چڑیا کوٹی صاحب)

خدائے کریم مسرور کرے حضرت احسنؔ کی روح کو بڑے پایہ کے شاعر، شاعر گر، سخنور، اور سخن نواز تھے، ان کا مرتبہ شعر و ادب، تحقیقِ زبان و فضل و کمال اتنا بلند تھا کہ ان کے معاصرین میں بھی کوئی ان کا ہم پلّہ نہ تھا۔ دورِ حاضرہ کی کساد بازاری سے تو کیا امید ہو سکتی ہے۔ بدو شعور سے اُردو و ادب کی خدمت کی۔ ان کی زندگی کا ہر دور اس کاوش میں گذرا بلکہ ان کی "زندگی" ہی ادب تھی۔ عمر کا آخیر حصہ بھی اسی ذوق میں تمام ہوا لیکن خدمتِ ادب کا ذوق کبھی ختم نہیں ہوا۔

افسوس ہے کہ اُردو کا یہ علمبردار، ادب کا شہیر۔ ادب نوازی کے اہم جذبات اور عظیم الشان تجویزیں اپنے ساتھ لے گیا۔ اب کون ہے جو اِن کی تکمیل کرے گا۔ آؤ ہم احسنِ مرحوم کے ساتھ اُردو ادب کا بھی ماتم کریں۔

حضرت احسن مرحوم کو سمجھنا ہو تو ان کا رسالہ فصیح الملک دیکھو جو اب تک یکتا رہا ہے اور معلوم نہیں کب تک رہے گا؟ "یادگار داغ" کا مقدمہ پڑھو۔ بلند پایہ تحقیقاتِ زبان پر لسانیات اور معانی و بیان کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالو۔ ان کی نظم اگر "حکمت" تھی تو نثر میں زورِ بیان سحر و جادو تھا۔ یہ دونوں خصوصیتیں کسی فردِ واحد میں جمع نہیں ہوتیں۔ ع

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

احسن اپنے شاگردوں اور استفادہ کرنے والوں کے لئے چشمۂ فیض و برکات

استاد تھے اور اپنے استاد کے مایۂ ناز شاگرد۔ احسن کی یہ خصوصیت سب سے زیادہ باعظمت اور پُر وقار تھی۔ احسن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اخلاق کا سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھ لے کہ سب سے زیادہ نظرِ کرم مجھ پر ہے۔ احسن اس خلق کے حامل تھے۔ عالم تھے اور صوفی بھی۔ صوفی زاہدِ خشک نہیں بلکہ دل میں جذبات کا گداز اور درد کی تڑپ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ متانت اور شائستگی کی تصویر تھے۔ اس تصویر میں محبت اور شفقت کی رنگ آمیزی تھی اور خاندانی شرافت و وقار کی گلکاریاں۔

احباب کے دوست تھے۔ مخالفین کے لطف فرمائے درگزر و عفو۔ اور کیا کہا جائے۔ ع

شب بسر آمد و افسانۂ حُسنش باقیست ۱۲

حضرت احسن مارہروی کا ذوق علمی اور ان کے بعض ادبی شاہکار

از محمد ابو اللیث صدیقی بدایونی۔ بی۔اے آنرز، ایم۔اے (علیگ) لکچرار شعبۂ اردو

الحاج حضرت شاہ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی میرے استاد تھے اور کم وبیش سات سال تک مجھے ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان کی صحبت میں جو برکات میں نے حاصل کیں ان کی تفصیل کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں، صرف زبان و ادب کے بارہ میں اتنا عرض کروں گا کہ اردو زبان کی خدمت کا شوق اور اس کے مطالعہ کا چسکہ مجھے مولانا کی ہی بدولت پڑا، ۳۲ء کا واقعہ ہے میں پہلی مرتبہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا ان دنوں تار والے بنگلے میں مقیم تھے، شام کا وقت تھا اور مولانا کے گرد وپیش ملاقاتیوں کا ایک ہجوم تھا، کچھ طالب علم، کچھ ملنے ملانے والے، کچھ اعزا اور اقربا سب قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے، مولانا کا پاکیزہ لباس، نورانی صورت، شگفتہ چہرہ تقدس اور محبت کے فریم میں آج تک میری نظروں کے سامنے پھر رہا ہے، یہ پہلی ملاقات تھی، اس دن اردو ادب کے متعلق بعض باتیں مولانا نے دریافت فرمائیں اور مجھے اپنی بے بضاعتی پر بڑا رنج ہوا۔

اس دن سے میرا معمول تھا کہ اوقات درس کے علاوہ بھی کبھی کبھی مولانا سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے مولانا کو تکلیف دیتا تھا، اور مولانا خندہ پیشانی سے اپنے بزرگوں کی ضرب المثل محبت، خلوص اور ایثار سے میرے جا اور بیجا استفسارات کا جواب اور وہ بھی ہمیشہ تشفی بخش عنایت فرماتے، یہ سلسلہ مولانا کی آخری علالت تک قائم رہا جب وہ مرض الموت میں گرفتار ہو کر وطن سے علی گڑھ تشریف لائے، پٹنہ کو روانگی سے پہلے میں حاضر ہوا اور کیا معلوم تھا یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ جلد ہی پٹنہ کے ایک تار نے انکے

انتقال کی خبر سنائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کی وفات سے ہماری بزم میں جو جگہ خالی ہوگئی اب اس کا پُر کرنے والا مستقبل قریب میں کوئی نظر نہیں آتا۔

فروغ شمع جواب ہے رہے گا رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

مولانا کے ذوق علمی اور ان کی تحقیق وتلاش کے کارنامے ہماری ادبی محفلوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، تحقیق کے معاملہ میں ان کا یہ حال تھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور کسی لفظ یا شعر پر کچھ اختلاف ہوا، مولانا اپنی وسیع النظری کے بھروسہ پر جواب اور فیصلہ تو فوراً صادر فرما دیتے لیکن اپنے قطعی یقین کے باوجود ہمیشہ ضروری کتابیں فوراً طلب کرتے، اگر کوئی کتاب اس وقت آسانی سے نہ آسکتی تو مولانا خود یونیورسٹی کے کتب خانہ میں تشریف لے جاتے اور ہم لوگ بھی ہمراہ ہوتے، مولانا ایک سند پر اکتفا نہ کرتے بلکہ متعدد اسناد پیش کرکے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے طے فرما دیتے۔

کتابوں سے انھیں عشق تھا اور اسی وجہ سے اپنی کتابیں دوسروں کو عاریتاً دینے میں بھی تکلف تھا، مجھ سے مولانا کو بڑی محبت تھی لیکن مجھے بھی کتابیں اسی وقت ملتیں جب میرے ذمہ کسی کتاب کی واپسی باقی نہو، قدیم اور جدید مصنفین اور مولفین کی بیشتر تصانیف بالخصوص شعر وادب اور تاریخ زبان پر مولانا کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھیں اور بہت کم ایسا ہوتا کہ ہمیں کتابوں کی تلاش میں کہیں اور جانا پڑتا۔

اسی شوق میں مولانا دوسروں کے کتب خانوں کی سیر میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے، ایک مرتبہ کتب خانہ نواب صدر یار جنگ بہادر اور ایک مرتبہ کتب خانہ خدا بخش بانکی پور (پٹنہ) کی سیر میں میں مولانا کے ہمراہ تھا اور ان کتب خانوں کے نوادر دیکھ کر مولانا اتنا ہی محظوظ ہو رہے تھے جتنا کوئی سیاح کسی دور دراز ملک کے کسی نادر الوجود عجائبات کو دیکھ کر خوش ہوسکتا ہے۔

عام طور پر لوگ مولانا کو پرانے رنگ میں کہنے والے شاعروں میں سرآمد سمجھتے تھے اور ان کی عروض دانی شعر فہمی اور تنقید کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، لیکن شاعری کے علاوہ ادب کے دیگر اصناف پر بھی اُن کو بڑی زبردست قدرت حاصل تھی، تاریخ زبان کے مقابلہ میں ان کی وسعت نظر اور عمیق مطالعہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، اُردو نثر کی تاریخوں میں ان کی مشہور کتاب نمونہ منثورات عدیم المثال ہے۔ اس سے پہلے جن لوگوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے انھوں نے اسے تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے یہاں مواد کم اور تنقید زیادہ ہے، انشاپردازی کے زور سے بعض معمولی مطالب اور غیر اہم مباحث کو پھیلا کر بیان کر دیا ہے۔ مثلاً اُردو کے اسالیب بیان یا سیر المصنفین، لیکن مولانا کے یہاں اردو نثر کی قدیمی اور عصر حاضر کے نمونے اس کثرت سے جمع کر دیئے گئے ہیں کہ اس کتاب کو اصل ماخذ دیکر بہت کچھ مفید کام کیا جا سکتا ہے اس کتاب میں سب سے پہلے اُردو زبان کی مختصر تاریخ اور نثر کی ابتدا سے بحث کی ہے اور پھر ہر دور کی مشہور کتابوں، رسالوں اخباروں، سرکاری کاغذات، مراسلات کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ہر دور کے آخر میں اس دور کی خصوصیات اس دور کے متروکات اور ایجادات کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے، اس ضمن میں بعض تصانیف کے سلسلہ میں انکے مصنفین پر مجموعی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ پرانے اخباروں کی تفصیل خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے۔ اکثر اخبار ایسے نظر آتے ہیں جن تک اب رسائی دشوار ہے۔ اگر کبھی اُردو صحافت کی تاریخ لکھی گئی تو اس کے مصنف کو مولانا کی کتاب کے اس حصّہ سے ضرور مدد ملے گی۔

تاریخوں کی صحت پر مصنف نے خاص طور پر زور دیا ہے۔ سنہ عیسوی اور سنہ ہجری دونوں ایک ساتھ دیئے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والے اپنی اپنی عادت کے مطابق جس سنہ سے چاہیں زمانہ کا یقین کر لیں۔

کتاب کا انداز بیان محققانہ اور سلیس ہے۔ انشاپردازی کا زور دکھانے کی کوشش کہیں نہیں کی گئی ہے تاہم سلاست نے عبارت میں پھیکا پن پیدا نہیں کیا ہے۔

اور نہ اختصار کے سامنے ضروری مطالب کو قربان کیا ہے۔

نثر میں دوسرا اہم کارنامہ کلیات ولی کا مقدمہ ہے جسے انجمن ترقی اردو نے ولی کی کلیات کے ساتھ شائع کرایا ہے۔ ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم بتایا جاتا ہے اسے ہم چاہے تسلیم نہ کریں لیکن یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ اردو شاعری کا عام رواج انھیں کے دور سے ہوا اور اس شاعری میں جدت کا رنگ انھوں نے ہی اپنے قلم سے بھرا، لیکن ابنائے وطن کی غفلت شعاری میں ان کی پیدائش، سکونت، وفات اور عام حالات زندگی عرصہ تک پردۂ خفا میں رہے اور اسی وجہ سے اردو شاعری کے اس مجدد اعظم کی تاریخی حیثیت میں بہت بڑی کمی واقع ہو گئی، مولانا جنھیں قدیم ادب سے بڑی دلچسپی تھی اور جو ولی کے عہد کی قدیم دکھنی زبان سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے۔ ولی کو عصر نو سے متعارف کرانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے، مولانا نے جس کد و کاوش سے ولی کے دیوان کے قلمی نسخے جمع کئے اور جس عرق ریزی اور محنت سے ان کا مطالعہ اور مقابلہ کر کے ایک مکمل اور صحیح نسخہ مرتب کیا وہ انھیں کا حصہ تھا، جن لوگوں کو قدیم نسخوں کے پڑھنے اور مقابلہ کرنے کا خود موقع ملا ہے وہ ہی اس محنت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ بعض نسخے نامکمل تھے، بعض بے انتہا بدخط، بعض میں ضرورت سے زیادہ تحریف تھی، ایک ایک لفظ کی صحت کو پرکھ کر اسے علیحدہ کرنا بغیر وسیع مطالعہ اور محنت کے ناممکن تھا، اس پر جیسے فاضلانہ مقدمہ لکھا وہ بھی اب تک ولی پر آخری حرف ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے ولی پر کام کیا ہے اُنھوں نے یا تو مولانا کے اس ماخذ سے فائدہ اٹھایا ہے یا پھر کہیں کہیں مولانا سے جزوی اختلاف کیا ہے۔ لیکن من حیث المجموع اب تک اس کتاب کی اہمیت اپنی جگہ ایک اٹل ستون کی طرح قائم ہے۔

نثر میں ایک اور بڑا کارنامہ انکے استاد نواب مرزا خاں داغ کی سوانحعمری اور انکی شعری پر ایک فاضلانہ تبصرہ ہے اس کتاب کے انداز بیان اور ترتیب میں کہیں کہیں شبلی کی جھلک نظر آجاتی ہے ویسی ہی زوردار زبان، ترتیب

میں جدت اور انداز میں ایک خاص کشش موجود ہے جو شبلی کے موازنہ انیس و دبیر کی خصوصیات ہیں۔ ایک کتاب کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ مولانا نے جس شخص کے سوانح حیات اس میں قلمبند کیے ہیں برسوں اس کی صحبت میں رہ کر فیض اٹھایا تھا، ہر واقعہ یا تو خود ان کی آنکھوں کے سامنے گزرا تھا یا انھوں نے خود استاد کی زبان سے سنا تھا اور مکمل کتاب بھی انھیں کی آخری نظر کے بعد منظر عام پر آئی تھی، داغ کی شاعری جن کمالات کا مجموعہ ہے اس کے بیان کا یہ محل نہیں لیکن داغ پر جب بھی کوئی سوانح نگار یا ناقد قلم اٹھائیگا اس کی راہبری کرنے کے لئے پہلا سنگ راہ یہیں ملے گا۔

یہ تیسرا کارنامہ اگرچہ پہلے دونوں کارناموں کے مقابلہ میں نسبتاً ابتدائی عمر کی یادگار ہے لیکن اس میں بھی پختگی اور سنجیدگی جو مولانا کی اور تحریروں کی خصوصیت ہے۔ موجود ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال باوجود قدیم دبستانوں کی تعلیم کے عربی اور فارسی کے غریب اور نامانوس لغات سے اجتناب ضروری اختصار، غرض فصاحت اور بلاغت کے تمام جزئیات کو ملحوظ رکھا ہے۔

داغ ہی کے متعلق مولانا نے ایک اور دلچسپ سلسلہ داغ و احسن کے عنوان سے شروع کیا تھا، افسوس ہو کہ اس کام کی ابتداء اسوقت ہوئی جب مولانا پر اضمحلال کے آثار پیدا ہونے لگے تھے اور یہی وجہ ہوئی کہ یہ مکمل نہ ہوسکا داغ و احسن کی صحبتوں میں جو علمی رموز اور شاعرانہ نکات بحث و مباحثہ میں آتے رہے تھے، ان کی یہ ایک ایسی مکمل اور جامع تاریخ ہوتی جو شعر و ادب کے طالب علم سر آنکھوں پر رکھتے۔

پرانے ہی زمانہ کی یادگار مولانا کا ایک اور مقدمہ محسن کاکوروی کی نظم دل افروزگی، "تخمیس" پر ہے۔ محسن کاکوروی کی شاعری پر امیر علوی نے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ فصیح الملک میں شائع ہوا، اس پر مولانا کی تمہیدی رائے بھی شامل ہے۔ ان "تخمیس" اور مقدمہ کو کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ جس سے محسن کی شاعری کی خصوصیات کے علاوہ نعت گوئی کی عام تاریخ پر بھی بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ فقط

داغ و احسن

از جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے لکچرار شعبۂ فارسی۔
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

زیادہ نہیں۔ اب سے تیس پینتیس برس پہلے ملک کے ادبی حلقوں میں داغ و امیر۔ غالب۔ وذوق۔ انیس و دبیر۔ میر و مرزا کا نام ساتھ لیا جاتا اور کمال فن میں اُن کے مابین موازنہ کیا جاتا تھا۔ ایک فریق ایک کو ترجیح دیتا تھا۔ دوسرا دوسرے کو۔

اور اس میں تعصب و غلو اس حد تک برتا جاتا تھا کہ خدا کی پناہ۔ مجھے اپنے وطن کے ایک بزرگوار کا قصہ اب تک یاد ہے۔ وہ امیر کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کو من کل الوجوہ تمام جہان سے افضل مانتے تھے۔ یاد ش بخیر جس زمانہ کا یہ ذکر ہے وہ بھی عجب بے فکری کا زمانہ تھا۔ جدھر دیکھو علمی و ادبی جلسے جمے ہوئے ہیں اور جہاں سنو شعر وسخن کے تذکرے، چھڑے ہوئے ہیں۔ غرض ادھر وہ حضرت آئے۔ اُدھر یاروں نے چھیڑنے کو امیر کے اشعار داغ کے نام سے سنائے۔ سننا تھا کہ انھوں نے سیکڑوں نام دھرنے شروع کئے۔ لاحول ولا قوۃ۔ داغ کو تمیز بھی ہے شعر کہنے کا۔ جاہل مطلق! شعر کہنا کیا جانے۔ کس قدر پست خیال ہے۔ کیسا سوقیانہ انداز ہے۔

اسی طرح کبھی داغ کا کلام امیر کے نام سے پیش کر دیا جاتا۔ پھر کیا تھا۔ تعریفوں کا پل بندھ جاتا۔ اے سبحان اللہ۔ استادی اس کا نام ہے۔ کمال فن اسے کہتے ہیں شوخیٔ ادا تو دیکھئے۔ زبان کی فصاحت پر تو نظر کیجئے۔

لیکن آخر میں جب حقیقت حال کھلتی اُس وقت اُن کی خفت دیکھنے کی قابل ہوتی۔ پھر یہ نہ تھا کہ وہ مذاق سخن سے سراسر بے بہرہ ہوں۔ مگر تعصب کا کیا علاج ہیچ ہے۔
حُبّک الشئ یعمی ویصم۔

خیر افراط و تفریط کی تو سند نہیں۔ اُس زمانہ میں کم از کم یہ تو عام رائے تھی کہ میدان سخن کے یہ شہسوار ضرور ایک دوسرے کے لگ بھگ ہیں۔ اور اگر اُن میں کوئی فرق ہے بھی تو انّیس بیس کا۔

آخر زمانہ بدلا اور اُس کے ساتھ اُس کے مقتضیات اور رجحانات بھی بدلے۔ مغربی طرز تنقید کا نتیجہ کہو۔ یا ادبی حقیقت پسندی کا اثر۔ اہل ادب کا زاویہ نگاہ بھی یکسر بدل گیا۔ آج غالب کی حقائق نگاری کے سامنے ذوق کی زبان آوری۔ انیس کی ترجمانی فطرت کے روبرو دبیر کی خیال آفرینی اور میر کی سادگی و پُرکاری کے مقابلے میں مرزا سودا کی شوکت و زورِ بیان قطعی طور پر ہزیمت خوردہ نظر آتی ہیں۔ یہی حال داغ و امیر کا ہوا بے شبہ امیر مینائی عالم تھے۔ مفتی تھے۔ استاد فن اور زبان کے محسن تھے۔ اس سے کسی انصاف پسند کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر جہاں تک شاعری اور غزل گوئی کا تعلق ہے وہ داغ سے کہیں فروتر مانے جاتے ہیں۔

داغ پر عموماً دو بڑے الزام لگائے جاتے ہیں۔ علمی سرمایہ کی کمی اور سوقیانہ عریانی کی افراط۔ پہلے الزام کے جواب میں علّامہ شبلی کا قول نقل کر دینا کافی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "اہل عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر رسمی علوم سے بے بہرہ ہوگا اُسی قدر بڑا شاعر ہوگا۔ یہی بات ہے کہ جاہلیت کے شعرا کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔ شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں"

نہ صرف عرب۔ بلکہ یونان و روما وغیرہ کے شعرا پر نظر ڈال جائیے۔ جتنا شاعری کا پلّہ بھاری ہوگا۔ علوم رسمیہ کا پلّہ ہلکا ہوگا۔

رہی کلام کی پستی اور عریانی۔ اُس کی حقیقت یہ ہے کہ اس حمام میں بہت سے لوگ ننگے نظر آتے ہیں، داغ غریب ہی کا قصور نہیں۔ اس کے علاوہ یاد رہے کہ ہم داغ کو شاعر کی حیثیت سے جانچ رہے ہیں۔ نہ کہ ایک لیڈر یا رفارمر کی حیثیت سے۔ معلم اخلاق وہ ہرگز نہ تھے۔

اور نہ اُنہوں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کہاں تک ایک حقیقی شاعر کے معیار پر پورے اُترتے ہیں اس موقع پر ضرورت تھی کہ ہم کلام داغ کے محاسن بالتفصیل دکھاتے اور اُن کے دواوین سے اُن کی مثالیں پیش کرتے۔ مگر ایک طرف وقت کی قلّت اجازت نہیں دیتی دوسری طرف جہاں تک ملک کے جمہور نقادان ادب کا تعلق ہے اب داغ کی نسبت دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ سب متفق ہیں کہ کلام کی بے ساختگی اور تاثیر کے لحاظ سے اُن کو حقیقی شاعر کہنا مطلق مبالغہ نہیں۔ اُن کی رندانہ شوخی ادا اور بانکپن۔ معاملہ بندی چھیڑ چھاڑ طنز و طعن۔ بیان کی جدّت۔ زبان کی فصاحت۔ روزمرہ کی دلآویزی بندس کی صفائی نے ان کے طرز کو دوسرے معاصرین سے نہایت ممتاز کر دیا ہے۔ اس لئے اس کی مزید تفصیل تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔

داغ کو قدرت نے جہاں بہت سے اموریں امتیاز عطا کیا تھا وہاں تلامذہ اور اچھے تلامذہ کی کثرت میں بھی وہ اوروں سے ممتاز تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی دور افتادہ علاقہ ایسا ہو جہاں اُردو کے نام لیوا موجود ہوں اور اُن میں کوئی داغ سے نسبتِ تلمذ نہ رکھتا ہو۔ بیخود دہلوی۔ بیخود بدایونی۔ رسا رامپوری۔ احسن مارہروی۔ سائل دہلوی نوح ناروی۔ سیماب اکبرآبادی۔ حسن بریلوی داغ کے اُن مخصوص شاگردوں میں ہیں جو بجائے خود فلک میں استاد مانے جاتے ہیں۔ اگر اس فہرست میں علامہ اقبال کو بھی شامل کر لیا جائے تو داغ کی کلاہ فخر میں ایک نمایاں طرّہ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

داغ سے اُن کے تلامذہ کس حد تک متاثر ہوئے۔ ایک ایسا موضوع ہے جو طویل فرصت چاہتا ہے۔ آج کی مختصر صحبت میں ارادہ ہے کہ داغ کا رنگ ان کے نامور شاگرد مولانا احسن کی شاعری پر جس حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ اُس کی نسبت اظہار خیال کیا جائے شاید بے محل نہ ہو اگر بیشتر اُن سے اپنے تعلقات کی نوعیت اور اُن کی بعض خصوصیات کی طرف یہاں اشارہ کر دیا جائے۔

مولانائے مرحوم سے مجھے غائبانہ نیاز اُس زمانہ سے تھا جب وہ فصیح الملک نکالتے تھے۔ میں فصیح الملک کو پابندی سے دیکھتا اور اُس کے مباحث کو شوق سے پڑھتا تھا۔ اُس کے بعد دوسرے علمی وادبی رسائل میں مولانا کی نظم ونثر نظر سے گذرتی رہی اور دل پر اُن کے ادبی خدمات کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ مولانا مارہرہ شریف کے سادات کرام سے تھے جن کو پیرزادگی کی نسبت سے بدایون کے خاص وعام احترام وعقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اِس تعلق سے اور نیز مشاعروں کی شرکت کے سلسلے میں مولانا کو بارہا دیکھا ہے اور سنا بھی۔ مگر اس کے باوجود عرصے تک تفصیلی ملاقات کا موقع نہ ملا۔ آخر ۱۹۲۶ء میں جب میرا تعلق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہوا تو پہلی بار اُن سے مفصل تعارف کا شرف حاصل ہوا۔ کہنے والے نے سچ کہا ہے۔ الارواح جنود مجندۃ (الی آخرہ) پہلی ملاقات ہی میں مرحوم کے حسن اخلاق کا دل پر اچھا اثر پڑا۔ اور رفتہ رفتہ اُس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اتحاد خیال کا نتیجہ کہو یا اشتراک مذاق کا۔ کہ روز بروز ان کی شفقت اور میری نیازمندی میں ترقی ہوتی گئی۔ ایک عقیدتمند اور رفیق کار ہونے کے علاوہ مجھے مولانائے مرحوم سے ایک مزید علاقہ بھی تھا جس کا اظہار بعض خاص صحبتوں میں انھوں نے خود فرمایا۔ وہ یہ کہ میرے استاد حضرت فاضل اوحد مولانا محب احمد بدایونی علیہ الرحمتہ جو اپنے زمانہ میں علوم منقول ومعقول میں فرد فرید مانے جاتے تھے ابتدائی دور میں مولانا کے بھی استاد رہ چکے تھے۔ مگر درحقیقت تمام روابط کی اصل وہی خیالات کا اتحاد تھا جس کا ذکر اوپر گذرا۔ جب کبھی میں حاضر ہوتا یا وہ تشریف لاتے تو مزاج پرسی اور دریافت حال کے بعد ادبی۔ لسانی۔ لغوی مسائل چھڑ جاتے اور گھنٹوں یہی تذکرے رہتے۔ عام "سیاسیات" سے جو عموماً ہر جگہ نقل مجلس سمجھے جاتے ہیں میری طرح مولانائے مرحوم کو بھی چنداں رغبت نہ تھی۔

غرض اِن تعلقات خصوصی کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا کے عام حالات اور اخلاق وعادات کی نسبت اظہار خیال کرنا

اُن کے سوانح نگار کا فرض ہے۔ مگر اجمالی طور پر اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ وہ قدیم شرفا کے اخلاق اور مشرقی تہذیب کا مکمل نمونہ تھے۔ اور چونکہ خود اِن امور پر سختی سے کاربند تھے اس لئے اگر کسی سے کوئی جُزوی فرد گذاشت ہوجاتی تو ان کو تکلیف ہوتی۔ اگر بے تکلفی ہوتی تو صاف دلی سے فوراً اظہار فرمادیتے۔ ورنہ اُن کے بشرے سے ناگواری کے آثار ضرور نمایاں ہوجاتے۔ البتہ ان کے ادبی مشاغل کے بارے میں چند سطور یہاں شاید بے موقع نہ سمجھی جائیں۔

مولانا عربی سے واقف تھے۔ فارسی اور سیات اُس زمانہ کے طرز تعلیم کے مطابق گھر پر تحصیل کی تھی۔ اور اُردو کے ایک نامور شاعر اور مستند ادیب تھے۔ مولانا جتنے بڑے شاعر تھے اُس سے بڑے انشا پرداز تھے۔ اور اُردو کی خدمت کے سلسلے میں اُنھوں نے جوانی کے عہد سے زندگی کے آخر لمحوں تک یعنی تقریباً نصف صدی تک جو کام کئے انکے لحاظ سے اُن کو فنا فی الاردو کہنا بالکل بجا ہے۔ پھر یہ خدمت پیشہ ور اصحاب کے اصول پر جلب منفعت کی غرض سے نہ تھی بلکہ ایک قدرتی لگن تھی جو ہمیشہ اُن کے دل کو لگی رہتی تھی۔

ان کا ادبی مذاق ستھرا اور فنی واقفیت گہری تھی۔ جس پر کثرت مطالعہ سے برابر جلا ہوتی رہتی تھی۔ کتابوں کے جمع کرنے اور مطالعہ کرنے میں اُن کو روحانی لذت ہوتی تھی۔ اوّل تو جب کوئی نئی کتاب شائع ہوتی یا کوئی رسالہ نکلتا تو اُن کی خدمت میں لازماً بھیجا جاتا دوسرے وہ خود بھی وقتاً فوقتاً کتابیں خرید کر اپنے ذخیرہ میں اضافہ کرتے رہتے۔ تحقیق مسائل کا یہ عالم تھا کہ جب تک کسی بحث کی نسبت اپنا اطمینان نہ کرلیتے بےچین رہتے۔ اور اِن امور میں بعض وقت اپنے چھوٹوں سے بھی مشورہ کرنے میں تامل نہ فرماتے۔

خدمت اردو کا شغف اور اس خصوص میں اُن کی سوجھ بوجھ حیرت انگیز تھی۔ جن اصحاب نے ۱۹۰۵ء کے فصیح الملک کے مضامین دیکھے ہیں وہ اس بیان کی تصدیق کرسکتے ہیں۔ اِن مضامین میں مولانا نے اب سے ۳۵-۳۶ سال پیشتر ملک کو اُن تدابیر

واصلاحات کی طرف متوجہ کیا ہے جن کی ضرورت بھی خواہانِ اُردو نے اب محسوس کی ہے۔ کتابت میں تلفظ کی مطابقت۔ رسم الخط کی اصلاح املا کی صحت۔ زبان کی توسیع الوق الفاظ سے پرہیز۔ شاعری کے بارہ میں معتدلانہ روشن۔ مشرقی اور مغربی افراط و تفریط سے اجتناب۔ اور اسی قبیل کے بہت سے مباحث تھے۔ جن کی حمایت میں مولانا اُس زمانے میں جہاد بالقلم کر رہے تھے جبکہ ہمارے بہت سے اہل قلم میدان میں بھی نہ آئے تھے۔ وکفیٰ بہٖ فخرا۔ دراصل یہ موضوع ایک مستقل بحث کا محتاج ہے اس لئے مجبوراً اس سے صرف نظر کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اُن کے انشا پردازانہ کمالات جن سے ملک کے ادبی رسائل اکثر بہرہ مند ہوتے رہتے تھے۔ اور اُن کی تصنیفات جنہوں نے ادب اُردو میں گراں قدر اضافہ کیا ہے جداگانہ تبصرے کے طالب ہیں۔ مگر قلت فرصت کے باعث اس کو بھی ترک کیا جاتا ہے۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا محض استطراداً تھا۔ دراصل یہ دیکھنا تھا کہ داغ کا اثر مولانا کی شاعری (خصوصاً غزل) پر کہاں تک ہوا۔ اسی سلسلہ میں دوسرے اثرات کا تذکرہ بھی آجائے گا۔

مولانا کی اصل خاکِ پاکِ بلگرام سے ہے جہان کا ہر فرد بقول غالب جوہر قابل کہے جانے کا مستحق ہے۔ سادات بلگرام ہی کی ایک شاخ ہے جو عرصہ سے مارہرہ میں سکونت پذیر اور مسند ارشاد پر متمکن ہے۔ اس شاخ کے اکثر افراد علم وفضل کے حامل اور صلاح و تقویٰ سے متصف گذرے ہیں۔ مولانا کے بزرگوں میں حضرت صاحب عالم اور حضرت شاہ عالم جو مرزا غالب کے ممدوح تھے علمی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مولانا کی تعلیم و تربیت اچھے ماحول میں ہوئی۔ اور بدو شعور ہی سے اُنہوں نے اپنے گرد علمی صحبتیں اور ادبی چرچے دیکھے سنے۔

عنفوان جوانی میں اُنھوں نے داغ دہلوی سے تلمذ اختیار کیا اور کئی سال استاد کی خدمت میں رہ کران سے فیض اٹھایا۔ داغ دراصل قدیم کلاسیکل طرز شاعری

کے خاتم تھے جن کو دہلی اسکول کی آخری یادگار سمجھنا چاہیئے۔ داغ کے یہاں جرأت کی شوخی۔ آتش کا بانکپن۔ ذوق کی زبان سب کچھ ہے۔ مگر سب سے مستزاد انکی اپنی انفرادیت ہے۔ جس نے اُن کو تمام معاصرین سے ممتاز کر دیا ہے۔

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ مولانا کے کلام میں صفائی اور سادگی۔ تصنّع اور رعایات سے اجتناب۔ زبان کی صحت اور متروکات کا خیال داغ کے فیضان صحبت کا اثر ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک اور عنصر بھی ہے جس سے مولانا کی زندگی اور نیز شاعری کم و بیش متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس سے ہماری مراد جدید رجحانات ہیں جن کو عام طور پر نئی تعلیم کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔

مولانا نے ایک قدیم خیال کے خاندان میں نشو و نما پائی۔ جہاں انگریزی تعلیم تو درکنار ترکی ٹوپی اوڑھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لڑکپن میں ایک دفعہ کہیں مولانا نے ترکی ٹوپی اوڑھ لی جس پر بزرگوں نے خوب اُن کو ہدف ملامت بنایا۔ لیکن زمانہ کے دھارے کے خلاف چلنا آسان نہیں۔ سادات مارہرہ میں مولانا غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم کی ضرورت محسوس کی اور جدید خیالات سے کم و بیش فائدہ اٹھایا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ مولانا نے قدیم و جدید کی کشمکش میں توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اپنی صلاحیت طبع اور سلاست ذوق کی بدولت دونوں کے درمیان ایک معتدل راہ تلاش کر لی۔ اُنھوں نے دیکھا کہ ایک طرف قدیم لکیر کے فقیر مبالغہ اور تصنّع پر مٹے ہوئے ہیں۔ لفظوں کے طوطا مینا بناتے ہیں اور اگر کوئی (خواجہ حالی کی طرح) پرانی ڈگر سے ایک قدم ہٹاتا ہے تو اُس کو نام دھرتے ہیں اور دوسری طرف مغربی خیالات کے شیدائی ہر قدیم چیز کی مخالفت کرتے۔ "زندان تو جملہ درد ہانند" پر زور دیتے اور زبان و قواعد زبان کی جانب سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اس افراط و تفریط کے دوراہے پر ہو کر اُنھوں نے کافی غور و خوض کیا۔

اور آخر ایک درمیانی راہ نظر آگئی۔ جس کی طرف انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ ہر معاملے میں افراط تفریط بری ہوتی ہے۔ آج کل اکثر نئی پرانی دونوں شاعریاں اس طرح کی جاتی ہیں جن میں کوئی خاص اور تازہ لطف نہیں پایا جاتا۔ الاّ ماشاء اللہ ہم نئی شاعری کے مخالف نہیں ہیں .... فصیح الملک میں یہ کوشش کیجائیگی کہ ایشیائی پرانی طرز کے سوا نئے خیالوں کی ایسی نظمیں بھی شائع ہوں جو پرانے اور نئے دونوں اہل مذاق کی دلچسپی کے لئے موزوں ہوسکیں۔ اور اس کے واسطے یہ معیار رہے کہ خیال نیا اور نیچرل ہو مگر طرز بیان ترکیبیں۔ اور قیود وہی ہوں جن کی ایشیائی طبیعتیں عادی ہیں" (رسالہ فصیح الملک)

غرض مولانا نے اپنے شاعری خصوصاً غزل گوئی میں بھی اس اصول کو نبھانے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ اُن کی غزل میں نئے اور نیچرل خیالات تو نہ آئے۔ تاہم اتنا ہوا کہ مبالغہ۔ تصنع اور ابتذال بڑی حد تک مفقود ہو گئے۔ وہ یقیناً قدیم اسکول کے مقلد اور رنگ داغ کے معتقد تھے۔ لیکن جہاں وہ بعض جدید شعرا کی بے راہ روی پر جز بز ہو جاتے تھے۔ وہاں قدیم سخنوروں کے کلام میں عریاں خیالات پاکر بھی مکدر ہوتے تھے ایک جگہ لکھتے ہیں "فصیح الملک میں جو نظم شائع ہوگی۔ اُس میں وہ اسماء و الفاظ ہرگز نہ شائع کئے جائیں گے جو کسی مہذب شخص کی زبان پر نہیں آتے"۔ (رسالہ فصیح الملک)

مشرقی شاعری کی نسبت عموماً کہا جاتا ہے احسنہٗ اکذبہٗ یعنی سب سے اچھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ بولا گیا ہو۔ مگر جہاں تک ہمیں علم ہے مولانا ابتذال کے ساتھ مبالغہ کو بھی ناپسند کرتے تھے۔

لیکن واضح رہے کہ یہ انقلاب تدریجی تھا۔ یہ خیالات آغاز مشق سے ہے اُن کا نصب العین نہ تھے بلکہ زمانہ کے رفتار کے ساتھ ساتھ ان کا اثر بڑھتا گیا۔ مولانا کے ابتدائے کلام کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل کے اشعار پڑھیئے۔

کب وصل کے ہونے کی مجھے آس ہے تم سے　　　جھنجلا کے جو کہتے ہو کہ ہاں ہو نہیں سکتا

رخِ نازک بچائیے اپنا — عکس پڑتا ہے شمعِ محفل کا
چشمِ بد دور آپ کا جوبن — اب طلبگار ہے کسی دل کا
پڑے رہتے ہیں اپنے ناخنوں میں سیکڑوں ایسے — وہ کہتے ہیں ہلالِ چرخ دیکھے انگلیاں میری
نکل گئی ہیں جو دل سے کدورتیں مر کر — اُنہیں کا ڈھیر ہے عاشق کا یہ مزار نہیں
وہ سن کر سر دُھنی کی شکایت اس قدر برسے — کہ بانسوں آپ خجلت ہو گیا اونچا مرے سر سے
واعظ کے ساتھ دیکھئے احسن کا میل جول — عمامہ سر پہ اور بغل میں کتاب ہے
یہ شوقِ اضطراب نامہ میرا دیکھنا — اُن سے جوابِ خط کا منگایا ہے تار پر

اسی کے ساتھ عہدِ مذکور کے کلام میں خیالات کی رفعت اور بیان کی لطافت بھی قدم قدم پر ملتی ہے مثلاً

ملتا ہے اُس کا ڈھونڈنے والا کہاں کہیں — ملتا ہے آپ ڈھونڈئیے اُس کو جہاں کہیں
گردش نصیب چین سے بیٹھے کہاں کہیں — پیچھا تو چھوڑتا ہی نہیں آسماں کہیں
ملتی نہیں نگاہ کسی کی نگاہ سے — محشر میں چھپتے پھرتے ہیں وہ دادخواہ سے
تاکا جسے وہ اُٹھ نہ سکا جلوہ گاہ سے — اللہ کی پناہ تمہاری نگاہ سے
جورِ فلک کی ہے نہ تمہاری جفا کی ہے — ہم کو شکایت اپنے دلِ مبتلا کی ہے

سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد کے کلام میں یہ رنگ اور زیادہ نکھرتا گیا اور پختگی اور صفائی مشقِ سخن کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اسی کے ساتھ استاد[1] کے تتبع میں سادگی اور بے تکلفی، عدم تصنع اور بے ساختگی کی جانب میلان ہوا۔ زبان کی صحت اور متروکات سے احتیاط کے بارے میں استاد داغ کا ایک مشہور قطعہ[2]

---

[1] استاد کے فیضان کی طرف مولانا نے اپنے اشعار میں کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔
طرز چھپتی ہی نہیں داغ کے شاگردوں کی — احسن اوروں سے الگ اُن کی زباں ہوتی ہے
داغ کے بعد اور کس سے لیتے احسن مشورہ — دیدیا اپنی طبیعت کو لقب استاد کا

[2] اس قطعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تلامذہ داغ خصوصاً مولانا زبان کے بارے میں کن اصول و ہدایات پر کاربند تھے۔ قطعہ بخوفِ طوالت یہاں نقل نہیں کیا گیا۔ جلوہ داغ وغیرہ میں موجود ہے۔

ہے جو تلامذہ کے لئے ہدایت نامہ کے طور پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس قطعہ کے محرک اصلی مولانا ہی تھے۔ ساتھ ساتھ خیالات میں رفعت و متانت بھی اِس دور میں زیادہ نمایاں ہے اس دور متوسط کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

دل گیا ہی ضرور اُن کے ساتھ　　　کیوں گیا یہ خبر نہیں مجھ کو
قبر میں بھی تو مر کے پہونچا ہوں　　　راس کوئی سفر نہیں مجھ کو

کیا لاؤں ایک شکوۂ فرقت زبان پر　　　ایسے تو سیکڑوں ہیں ستم میری جان پر
محدود دل ہی میں نہیں آہ شرر فشاں　　　پہونچی ہے اِس چراغ کی لو آسمان پر
تھا اُن کا ہم خرام ضرور اک نیاز مند　　　آنکھوں کے بھی نشاں ہیں قدم کے نشان پر

ہی دن رات دھیان ہو گویا　　　دل میں وہ میہمان ہے گویا
ہیچ ہے سب جو ہم نہیں احسنؔ　　　جان ہے تو جہان ہے گویا

عالم تمام چشم حقیقت نگر میں ہے　　　اتنا بڑا کٹم مرے چھوٹے سے گھر میں ہے
ہوتا نہیں جو تیرِ محبت کا کچھ اثر　　　کیوں درد کی کسک مرے قلب و جگر میں ہے

یوں محو جمال اے رخ جانانہ بنا دے　　　یعنی مجھے اپنے سے بھی بیگانہ بنا دے
کچھ بات نہیں نعرۂ منصور میں لیکن　　　دنیا جسے چاہے اُسے افسانہ بنا دے

میری غفلت نے بنایا ہادیٔ منزل مجھے　　　آنکھ والے چونک اٹھے دیکھ کر غافل مجھے
شورشِ بحر فنا میں پائی تسکین بقا　　　موجِ طوفاں میں ملا ہے دامنِ ساحل مجھے
یہ تصرف ہے تصور کا کہ اے محمل نشیں　　　کوئی پردہ اب نظر آتا نہیں حائل مجھے
راہِ مقصد تک پہونچ کر پا شکستہ ہو گیا　　　اب لئے بیٹھی رہے آرام سے منزل مجھے

۱۹۲۲ء کے بعد جب وہ مسلم یونیورسٹی میں آگئے ہیں، ہمارے خیال میں اُن کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور شروع ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عمر کے ساتھ مشق اور مشق کے ساتھ سنجیدگی رُو بہ ترقی ہے اگرچہ اس دور میں بھی بطور تفنن طبع ایک آدھ شعر رنگ قدیم میں نکل جاتا ہے۔ مثلاً

مزے لے لے کے ذکر حور و غلماں شیخ کرتے ہیں — طبیعت پیر و مرشد کی جواں معلوم ہوتی ہے
کیسی مطلب آشنا تھی چشم شوخ — دل اڑا یا اور چمپت ہو گئی

لیکن مجموعی طور پر اس دور کا کلام متانت اور تاثیر میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ چند شعر سُنئے اور محظوظ ہوجیے۔

ذوق ایذا طلبی درد کا درماں نکلا — تیر بیٹھا میرے پہلو میں تو ارماں نکلا
نہ سہی قبر میں آکر مجھے راحت نہ سہی — تیرے چکر سے تو اے گردش دوراں نکلا
فنا بغیر بقا کا مزا نہیں ملتا — خودی مٹاؤ نہ جبتک خدا نہیں ملتا
کسی کو بھیجکر خط ہائے کیسا یہ عتاب آیا — کہ ہر اک پوچھتا ہے نامہ بر آیا جواب آیا
کشش حسن کی یہ انجمن آرائی ہے — ساری دنیا ترے کوچے میں سمٹ آئی ہے
جب سے کیا قفس نے اسیر محن مجھے — یادش بخیر بھول گیا ہے چمن مجھے
بیٹھ نہ تمکنت پسند چھپ کے حریم ناز میں — دل کی دوا دوش کو دیکھ رہ گزر نیاز میں
دل جھکا مائل طبیعت ہو گئی — آج بسم اللہ الفت ہو گئی
دے دیا دل جس کو ہم نے دیدیا — ہو گئی جس سے محبت ہو گئی
دل میں جب تک تھی اک بات تھی — لب تک آتے ہی شکایت ہو گئی
دل عشق میں ناچار ہے معلوم نہیں کیوں — مجبور یہ مختار رہے معلوم نہیں کیوں
جو کام زمانہ میں ہے سب کے لئے آساں — میرے لئے دشوار ہے معلوم نہیں کیوں
سکون جاتا ہے دل جاتا ہے صبر و ہوش جاتے ہیں — مگر الفت تری اے دشمن جانی نہیں جاتی
کیا کہوں شکوۂ غفلت کہ دیکھا انکو شرمندہ — یہ عالم دیکھ کر میری پشیمانی نہیں جاتی
اشاروں میں جو اک طرز بیاں معلوم ہوتی ہے — ترے چشم سخن گو کی زباں معلوم ہوتی ہے
چمکتی ہے بہت دور آشیاں سے برق سوزندہ — مگر مجھ کو قریب آشیاں معلوم ہوتی ہے
بساتی ہے یہی دنیا۔ بناتی ہے یہی عقبیٰ — محبت کارساز دو جہاں معلوم ہوتی ہے
میرا تمہارا دنیا افسانہ کہہ رہی ہے — کیا کیا نہ کہہ چکی ہے کیا کیا نہ کہہ رہی ہے

آغاز سوز الفت تھا شمع کی زباں پر　　انجام عشق، خاکِ پروانہ کہہ رہی ہے

ہو ذکر غم کسی کا میں یہ سمجھ رہا ہوں　　دنیا مجھی سے میرا افسانہ کہہ رہی ہے

دل دے کے جانے والو جاتے کہاں ہو ٹھہرو　　کچھ اور بھی نگاہ جاتا نہ کہہ رہی ہے

زبانِ قلم[1] داغ و احسن کی داستان ختم کر چکی۔ البتہ دل پر داغ احسن ہنوز باقی ہے۔ آہ اے زبان اُردو تو نے مولانا کی وفات سے اس نازک دور میں اپنا ایک مشہور شاعر۔ مستند ادیب ممتاز مصنف اور جاں نثار خادم کھو دیا۔ تیرے چاہنے والے اور پروان چڑھانے والے سلامت رہیں۔ یہ سب ہونگے۔ مگر احسنِ مرحوم اب کہاں۔

تیری بزم ناز میں ہیں جمع ساری خوبیاں
ایک احسن کی جگہ خالی بھری محفل میں ہے

---

[1] عجب اتفاق کہ ذرا تامل جو کیا تو اس مضمون کا سال نگارش قسطاس داغ و احسن (میزان)۔ نیز یادگار داغِ احسن (۱۳۶۰ھ) نکلا۔

احسن مارہروی (مرحوم)

از رشید احمد صدیقی (علیگ)

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں!

(میرؔ)

مولنا سید علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو اُن سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر اُن کا نام بڑی عزت و محبت سے لیا جاتا تھا۔ انکے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اُردو داں طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں اُن کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولنا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کی اُن لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو اُن کے پیشروں سے ان تک پہنچی تھی۔ بایں ہمہ وہ اُردو ادب و شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار۔ اس نئے دلبستاں کے نقطہ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے۔ خواہ شاعر کا مسلک اُن کے مسلک سے بالکل جدا گانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اردو میں مغربی انداز کی تنقید اُن کے سامنے مروّج و مقبول ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ اُردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا مولنا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات و تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے۔ دوسرے کے

نقطۂ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے۔ اس اعتبار سے ان کو "ترقی پذیر" اور ترقی پسند قرار دینے میں تامل نہ کرنا چاہیئے۔ ترقی پذیر یا ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سنے۔

رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹھ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور تواضع منشی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان، و بیان کے مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرا ہوا۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ مطلب برآری نہ ہوتی تو بلا کسی لحاظ و تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اُسی اُدھیڑبن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہو گئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے۔

اسبارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سعی و جستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات پروفیسر کرنکو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لئے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم متبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کرکے بتائیں گے۔ جب بات منقح ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے۔

پروفیسر کرنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ بوڑھے۔ ہنس مکھ۔ بات کرنے کے شائق۔ متوسط جسم لمبا قد۔ عینک لگائے ہوئے۔ اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی

واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لئے ضرور لائبریری پہنچتے ہیں پروفیسر کرنکو کو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفت گو کرتے ہوئے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب رکھتے ہوئے پاتا۔ گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اُسے مخاطب کر کے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی اس کا خلاصہ سنا کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ر Model de Luxe کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ ہر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اُس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ آدمیوں سے کم نہ تھی!!

باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمامتر مرحوم ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھتے کہتے تھے استاد داغ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر تانیث یا محل استعمال کے بارہ میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ اُن الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے۔ اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اُردو میں آتے اُن پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولٰنا مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس ارد و کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق و محنت سے جمع کرتے۔ کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں۔ ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولٰنا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولٰنا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے۔ اُن کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے

خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ نوجوانوں میں نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے انہیں ان سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام۔ کہتے تھے زبان کی غلطی کیسے سن لوں۔ ساری عمر اسی میں گذاری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولنا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کہیں تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔ ایک دن شعبہ اردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورداسپور میں ریلوے میں ملازم تھے۔ مسوّدات کا بستہ ساتھ تھا۔ اردو شعرا کا ایک مبسوط تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غریب نے ملازمت کس محکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے۔ ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی اثنا میں مرحوم تشریف لائے۔ نووارد سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولنا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور مولنا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسوّدہ کی طرف مائل ہوں۔

مولنا نے مطلقاً التفات نہ کیا اس سے نہ تو نووارد کی دلجمی ہوئی اور نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کو اصرار تھا کہ مولنا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی۔ مولنا نے کسی قدر اکتا کر مسودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھکر فرمایا۔ یہ کہاں کی اردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ کہکر مسودہ واپس کر دیا۔ اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولنا نے بغیر ان کی طرف رخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی، تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کی دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی۔ مولنا نے فرمایا تو میں کیا کروں۔ مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی

جرأت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا۔ کاتا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف بنے۔ میں نے عرض کیا مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چائے مفت میں پلوا دیں!

مولانا نے بے ساختہ بہت زور سے قہقہہ مارا۔ نوارد سے بہت کچھ التفات فرمایا اور بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سمائی نہیں۔ اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا۔

ایک بار ایک دوست نے مولانا کو اپنا انتہائی رازداں سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنا یا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بدنصیبی سے مولانا کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب "سینۂ بسمل سے پر افشاں" نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولانا سنی ان سنی کرتے جاتے تھے اور جب انھیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انھوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھرکم جسم کو اس طرح تولایا اُس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور تکان میں آکر پھونکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا۔

میں اُن کے ارادہ سے واقف ہو گیا میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی

اُن سے اتنی ہی دور کرلی جتنی انھوں نے قریب کی تھی مولانا کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ انھوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہ کیا اور نفس مضمون پر آنے کی جدوجہد شروع کردی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ پسپا نہ ہوں گے۔ چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اُٹھ کر بھاگا۔ مولانا بآں جسد عنصری میرا تعاقب بھی نہ کرسکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے فرمایا۔ رشید صاحب ارے وہ بھی سنا۔ میں بھاگنے کی سائنس و آرٹ یعنی (rear guard action) "ریرگارڈ ایکشن"* (جنگ پسپائی) سے پوری طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے ہی جوابدیا، جی ہاں مولانا میں ابھی آتا ہوں مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے۔ میں دروازہ سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی۔ میں گر گیا۔ مولانا نے راز فاش کر دیا تھا!۔

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ سترہویں صدی کے آخر یا اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے۔ اور اس خاندان کے بانی ہوئے۔ چنانچہ مرحوم کی خاندانی عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے۔ علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور تک مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پر چھوٹے

---

* اس سلسلہ میں غالب کا ایک شعر آپکو یاد ہوگا۔ اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق + جو پاؤں اٹھ گئے وہی انکے علم ہوئے!

چھوٹے بچّوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولنا کو بچّوں سے بڑی الفت تھی اور بچّے بھی ان سے اس طور پر وابستہ رہتے جیسے مولنا اُن کا کھلونا تھے۔ جب کوئی بچّہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا مولنا کے قریب جا کر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولنا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے ان کی طرف مخاطب ہوجاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہر بچّہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے کرتے پاجامے، سر پر بال باریک ترشے ہوئے۔ پاؤں میں جوتا۔ سر پر ٹوپی۔ چلنے پھرنے ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شستگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے ننگے سر پھرنے یا انواع اقسام کے نکر اور قمیص پہننے کا جو عام رواج ہے اور جیسے آزادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ مولنا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے۔ بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ یہ قُل اعوذیت تھی، قُل اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن نسوانیت یا شہدپن کے مقابلہ میں قل اعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لباس و جسم کی تنزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لئے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع، رہن سہن، مرنے، جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں۔ نہ ان کو ملزم قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اُن پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی و نیا زمانہ مجموعۂ صد کرامات

سہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاست کا ثمرہ تھی انسانوں اور انسانیت کے لئے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔

مرحوم پرانی دنیا کے آوردہ تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چپلیں سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور زیادہ نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے۔ مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے۔ کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے۔ ہر جگہ ان کی پذیرائی خوشدلی سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دولت پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے اور تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیسی کر گزرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے۔ اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب کبھی اُن پر فقرے بھی چست کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا۔ بھابی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جب کہ مرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو اکٹھا رکھنے میں تماشائے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو معترض کیوں ہوتے ہو!

مرحوم شاعری کے قدیم دبستان کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری، تصنیف و تالیف، تحقیق و تدقیق میں گزاری۔ اپنے استاد کے مسلم الثبوت پیرو تھے، لیکن کلام

میں استاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی۔ شوخی رنگینی وجدت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا۔ لیکن فنِ شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا۔ زبان محاورہ و مصطلحات و متعلقات شاعری کے سمجھنے پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اٹھتے جا رہے ہیں صحت زبان و مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے۔ کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس برتے پر کرے۔ شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے جا رہے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں۔ فنی تبحر بڑی اہم چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے اس لئے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولنا جیسا قادر الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گزرا ہے۔ شعر کہنا اُنکے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیحضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحۂ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولنا احسن مرحوم نے ان مضامیں کو مثنوی کی پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا۔ عالم یہ تھا کہ شعبۂ اُردو میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلبا اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جا رہی ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصّہ لے رہے ہیں۔ ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں۔ اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہو گئی۔ مولنا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے، جب اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیش نظر ہوں۔*

* مولانا احسن مارہروی مرحوم کے اس ادبی کارنامے کی قدر افزائی کے طور پر اعلیحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ نے اپنے دست مبارک سے ایک پرائیویٹ تحریر بطور شکریہ مولانا مرحوم کے نام روانہ فرمائی تھی اسکی عکسی نقل دوسری جگہ پیش کرنے کی ہم عزت حاصل کر رہے ہیں۔

ایک دن شعر شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے برسبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرعہ طرح دیدیا جائے اور اُن سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھکر غزل مکمل کر دیں۔ مولنا مرحوم یہ سنکر آپے سے باہر ہو گئے۔ آواز میں لکنت تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے تو اُن کا لب ولہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا تھا۔ ململ کا ڈھیلی آستین کا کرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اُٹھ بیٹھے۔ آستین چڑھالیں اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔ میاں ہوش میں آؤ۔ یہ کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر صاحب کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے۔ جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اُس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پر پڑیں تابڑ توڑ جوتے اس وقت مصرعہ طرح دو۔ پھر دیکھیں کون کتنے پانی میں ہے۔

مولنا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا۔ مولنا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعر کے صدر ہیں۔ اگر مجوزہ آداب آیندہ سے مشاعروں میں نافذ کر دیئے جائیں تو کیا ہو۔ مرحوم قہقہہ مار کر کرسی پر لیٹ گئے کہنے لگے، بڑا اچھا ہو، کمبخت گوّیوں سے نجات ہو جائے!

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں "فصل" میں کس کس قسم کے وحوش وطیور کہاں کہاں سے کھنچ کر آتے ہیں۔ اور صید وصیّاد، دانہ ودام۔ تمنّا وتماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولنا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صف اوّل میں وہ سب کچھ تھا جسکی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں بیکانوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ؎

کہاں لیجاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولنا کی باری آئی۔ بھلے مانسوں کے سیدھے سادھے لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی۔

ساز ندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن
بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہوگیا۔ اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی۔ جس کے اس شعر پر جو صفِ اول کو مدنظر رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرۂ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

بٹتی ہے امیروں میں تری حُسن کی دولت یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف و انہماک سے اس کا اہتمام کرتے تھے۔ اور شعرا و مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولنا ہی کے ہاں کوئی تقریب منعقد ہے۔ مولنا کے دم سے دو ایک دن بڑی چہل پہل کے گزرتے ہر شاعر کا پورا پورا حفظ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا۔

اسی سلسلہ میں ایک بار مولنا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا۔ چنانچہ رخصت لے کر بمبئی گئے۔ وہاں احباب اور قدر دانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اُس زمانہ میں یہاں پر وائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دیئے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولنا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے مولنا کے ساتھ ساتھ شعبہ اُردو کی بھی خیر

نہیں۔ میری طلبی ہوئی۔ مکالمہ سنئے۔

صاحب :۔ (سرخ ہوکر اور معہ کرسی میری طرف رخ کرکے) یہ کیا لغویت ہے ؟

میں :۔ (متعجب و سراسیمہ ہوکر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے جناب ؟

صاحب :۔ (چین بجبین ہوکر) بے شک۔ مولنا صاحب نے کیوں درخواست دی نہ ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض سے انھوں نے غفلت برتی۔

میں :۔ جناب والا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہی کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ بظاہر مولنا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہیئے۔

صاحب :۔ (نہایت غصہ ناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر گئے کیوں ؟

میں :۔ شعر پڑھنے۔

صاحب :۔ شعر!

میں :۔ شعر، جناب والا !

صاحب :۔ اپنے شعر ؟

میں :۔ مولنا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب :۔ لیکن یہ ہوا کیا۔

میں :۔ ہوتا ہوا تا کچھ نہیں عالی جاہا لیکن مانتا کوئی نہیں۔

صاحب :۔ تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے ؟

میں :۔ جناب والا میں اپنی نالائقی تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مولنا تشریف لائیں تو جناب اُن سے بھی گفتگو فرمالیں۔ بہت سی باتیں واضح ہوجائیں گی۔

صاحب :۔ بہت خوب، مولنا صاحب کو میرے ہاں لانا (کسی قدر زہرخند فرماکر) مجھے اب تک اُن سے ملنے کی مسرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

دوسرا منظر

پرو وائس چانسلر صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی۔ میں اور مولٰنا حاضر ہوئے۔ صاحب یکلخت جھجکے، لیکن فوراً ہی سرو قد ہو کر مولٰنا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پُرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرسان حال نہ تھا البتہ میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجا لانے میں زیادہ اہتمام مولٰنا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سرو قد کھڑے ہو گئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہو گئی۔

ڈراپ سین

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولٰنا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے۔ اور طالب علموں سے اُن آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولٰنا کلاس سے سخت آزردہ و برہم چلے آرہے ہیں — تھوڑی دیر میں طلبا بھی آ گئے۔ معلوم ہوا کہ بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے تھے۔ مولٰنا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔ معاملہ رفت گزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولٰنا سے گفتگو ہوئی۔ فرمایا۔ رشید صاحب طلبا پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گزاری اور تفریح تفنن کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کر لیں علم تو ان کو آنے کا نہیں! میں نے عرض کیا، مولٰنا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجئے گا۔ یہ طلبا کا قصور نہیں ہے۔ دنیا کا یہی رنگ ہے۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدر و قیمت رکھتی تھیں وہ اب مردود ہو چکی ہیں۔ حفظ مراتب اُٹھ چکا ہے۔ یہ زمانہ

احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کڑھیئے نہیں۔ لڑکوں کو معاف کر دیجئے۔ انکو نہیں معلوم وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کے شکار ہیں۔ مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا، بولے جی نہیں۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجئے۔ مولنا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا۔ مولنا فرض کیجئے۔ یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں۔ آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجئے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجئے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کرتے ہیں۔ مولنا دھیمے پڑگئے اور کسی قدر مدھم سروں میں انا للہ۔ پڑھکر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولنا کو چائے سے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے۔ اسی طرح آموں کے بھی بڑے شایق تھے۔ برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے تھے۔ لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو درکنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ذیابطیس کے پرانے مریض تھے۔ لیکن اس کی بالکل پروا نہ کرتے تھے۔ اس وضعداری نے کاربنکل سے دو چار کیا اور کاربنکل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعاد عمر ختم کرکے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے جو اُن سے بہت کم عمر والوں کے لئے مشکل تھا۔ اُن کے قوائے ذہنی وجسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں بزرگ، کیسے کیسے زمانے، کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوئے۔ یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۳۰ راگست ۱۹۴۰ء کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہنچ گئی۔

اگست ۱۹۴۰ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا، مکان سے یونیورسٹی آرہا تھا کہ خبر ملی کہ مولنا

احسن کار بنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے اور کیوں حضور، سنتا ہوں* خنداں شائع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے پڑھکر واپس کر دوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب، کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب، اللہ اکبر! میں مبہوت ہو گیا اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان وزمین کی ساری پہنائیوں پر مرحوم کی شخصیت مستولی ہو گئی ہے، میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے رشید صاحب خدارا کتاب بھیج دیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں! عجب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

---

* راقم الحروف کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ جو اس زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

اُردو ادب کا ماتم

از ابرؔ احسنی گنوریؔ

اردو کے گلستاں پہ خزاں دیکھ رہا ہوں
نیرنگ طلسمات جہاں دیکھ رہا ہوں

دولت کدۂ علم میں ماتم سا بپا ہے
یوں کف بہ دہن جہل کا سیلاب اٹھا ہے

ہر بے ہنری شعر میں جائز ہے ہنر ہے
یعنی جو حزف ریزہ تھا پہلے وہ گہر ہے

بے سود ردیفیں ہوئیں بیکار قوافی
اشعار نے بحروں سے طلب کرلی معافی

اشعار میں بھاتی کسے آخر یہ بناوٹ
جذبات کے اظہار میں ہوتی تھی رکاوٹ

دشواریاں جہل اپنا چھپاتے ہیں غضب تھیں
پابندیاں آزاد زمانے میں غضب تھیں

پھر کیا ہے جو کشتیٔ سخن غرق نہیں ہے
اب نثر میں اور نظم میں کچھ فرق نہیں ہے

شاعر انھیں کہئے کہ سمجھئے انھیں "ماسٹر"
کہتے ہیں نئی شاعری اس چیز کو شاعر

لٹتی ہے سرِ راہ یہ صدیوں کی کمائی
اللہ دہائی مرے اللہ دہائی

چلنے لگیں ہر سمت یہ مسموم ہوائیں
حیران ہیں جا کر کسے افسانہ سنائیں

ہیں داغ ہی دنیا میں نہ اب ذوق نہ غالب
میں کس سے مدد چاہے فنِ شعر کے طالب

ہے جنکی بدولت ابھی سرسبز یہ گلشن
ان میں ہی تھے نباضِ سخن حضرت احسن

تصویر تھے اُردو کے لئے رحمتِ رب کی
دریائے فصاحت کے گہر روحِ ادب کی

ہر لفظ چمکتا ہوا اک گوہرِ پُر آب
تھی طبع رواں ایک مچلتا ہوا سیلاب

ہر حرف تھا اک جذبۂ پرکیف سے سرشار
تنویر سے معنی کی چمک جاتے تھے اشعار

گلزار لطافت کی پلی طبع رواں تھی
جو چشمۂ کوثر میں دُھلی تھی وہ زباں تھی

اصنافِ سخن کی وہ ہر اک راہ سے آگاہ
وہ حاکم الفاظ تھے وہ فن کے شہنشاہ

معنی تھے ہر اک فقرے میں سر بستہ خزینے
اشعار کے ٹکڑے تھے چمکدار نگینے

ہر ٹکڑے میں پوشیدہ تھیں رنگین حکایات
ہر نقطے میں اک نکتہ تھا ہر بات میں اک بات

اک چیز تھی اندازِ بیاں کی یہ لطافت
شوخیِ محاکات تخیّل کی نزاکت

اشعار کی قیمت کے نہ موتی تھے نہ ہیرے
تھا سادہ بیاں اور معانی کے ذخیرے

وہ فضل کہ تابندہ تھا خورشید زمیں پر
وہ علم کہ جیسے کوئی بے تھاہ سمندر

پر پیچ طبیعت کے نکل جاتے تھے سب بل
وہ رہبر کامل تھے وہ استاد مکمل

تھا شغل شب و روز زر علم لٹانا
جیسے کسی فیاض کے ہاتھوں میں خزانا

تھی چستی بندش سے نمایاں یہ گواہی
میداں کے لئے جیسے مسلح ہو سپاہی

یہ رتبہ اصلاح کبھی گھٹ نہیں سکتا
جو لفظ جہاں رکھدیا وہ ہٹ نہیں سکتا

پڑھنے کے یہ انداز بھی انمول رہے ہیں
ہوتا تھا گماں داغ یہاں بول رہے ہیں

کس طرح نہ رہ جاتے وہ پھر ہند پہ چھا کے
تھے اُن کے ہی استاد بقر فکر رسا کے

بزم ادبا کی انھیں موزوں تھی صدارت
ہر رنگ میں ہر صنف سخن میں تھی مہارت

اللہ رے تکلم کی یہ تاثیر خدا داد
صحبت بھی جنھیں مل گئی وہ بن گئے استاد

کر دیتے تھے ہر مسئلہ دو باتوں میں وہ حل
دیتے تھے مخالف کو جواباتِ مدلل

اس شغل میں پروا ہی نہ کی رنج و تعب کی
سب عمر بسر ہو گئی خدمت میں ادب کی

اُن کو بھی جدا ہم سے کیا دستِ اجل نے
تیز اور بھی تخریب کے طوفاں لگے چلنے

تخریب کے یہ تیز مچلتے ہوئے دھارے
کشتیِ ادب کیسے لگے جا کے کنارے

ایسا تو نہ ہو اردو کو ہی یہ دور مٹا دے
آ روح ادب راہ پہ بھٹکوں کو لگا دے

شاہکار عثمانی

(از رحم علی الہاشمی صاحب)

حضرت احسن مارہروی کا نام ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے اور علم و ادب اور شعر و شاعری میں آپ کے متعدد شاہکار ایسے موجود ہیں کہ اُردو زبان اور اُردو کے نام لیوا جب تک زندہ ہیں اُس وقت تک یادگار رہیں گے اور آنے والی نسلوں کی ہدایت و رہنمائی کریں گے لیکن شاہکار عثمانی حضرت احسن کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ایک سلطان العلوم شہریار کی معارف پروری اور احترام دینی سے منسوب ہوکر افق شہرت و تابندگی کا آفتاب بن گیا ہے۔ اور جب تک آنے والی نسلیں دکن کے اس خدا پرست اور علم پرور شہریار کی یاد کو تازہ رکھیں گی اُس وقت تک حضرت احسن کا یہ شاہکار اور جس سبق آموز واقعہ پر یہ مبنی ہے برابر یاد رہے گا۔

شاہکار عثمانی جس واقعہ پر مبنی ہے وہ مختصر الفاظ میں صرف اس قدر ہے کہ اعلیٰحضرت سلطان العلوم فرمانروائے حیدرآباد و برار خلد اللہ ملکہ نے ایک عزیز نواب قدرت نواز جنگ بہادر نے پیش گاہ خسروی میں ایک نادر نسخہ کلام پاک پیش کیا اور یہ استدعا کی کہ اس نسخہ کو شاہزادہ معصوم جواد جاہ مرحوم کے مزار پر رکھدیا جائے تاکہ فاتحہ خوانی کو آنے والے لوگ اس کی تلاوت سے بہرہ اندوز ہوں۔ اعلیٰحضرت نے اس متبرک تحفہ کو قبول فرماکر بلحاظ ادب و احترام سر پر رکھ لیا۔ بعد کو بتاریخ ۲۹ محرم ۱۳۵۶ھ اعلیٰحضرت کے قلب پر القا ہوا کہ اس نسخہ کلام پاک کو بجائے شاہزادہ معصوم کے مزار پر رکھنے کے جوبلی پویلین میں رکھا جائے جو جشن سیمیں کی یادگار ہونے کی وجہ سے مرجع خلائق ہے اور اس سے نسخہ مذکور کے افادہ کا حلقہ بہت زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت قدر

واعلیٰ نے اس فیصلہ کے ساتھ چند دعا یہ الفاظ کلام پاک پر قلم بند فرما دیئے۔ یہ واقعہ الفاظ میں تو اس اختصار کے ساتھ بیان ہو گیا لیکن اس کا پس منظر اس قدر وسیع المعنی ہے کہ دفتر کے دفتر اس پر لکھے جا سکتے ہیں چنانچہ حضرت اقدس واعلیٰ کے مصاحب خاص حضرت ہوش بلگرامی نے اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں اس سارے واقعہ کو نثر اردو میں لکھکر بغرض اشاعت اخبارات کو بھیجدیا۔ واقعہ کی معنویت اور حضرت ہوش کے طرز بیان کی ندرت نے حضرت اقدس واعلیٰ کو بہت متاثر کیا اور اس علم پرور شہریار نے حضرت ہوش کے اردو مضمون کو فارسی زبان میں ترجمہ فرما دیا تاکہ فارسی کے اہل زبان بھی اس سے محظوظ و مستفیض ہو سکیں۔ اسی کو حضرت احسن نے اپنے مخصوص اور استادانہ انداز میں نظم فرمایا ہے جسے شاہکار عثمانی کا نہایت ہی موزوں نام دیا گیا ہے۔ اور جیسی کہ توقع تھی حضرت اقدس واعلیٰ نے جناب احسن کی اس کوشش کی شاہانہ قدر افزائی فرمائی اور اپنے مکتوب خاص سے حضرت احسن کو نوازا جو مرحوم کے خاندان میں نسلاً بعد نسل یادگار رہے گا۔ حضرت احسن کی اس یادگار اور بیش بہا نظم کی بعض خصوصیتوں پر ہم اس مضمون میں روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

حضرت احسن مرحوم کی شاعری کا کمال یہ تھا کہ وہ ہر صنف سخن پر قادر تھے اور یہی نہیں بلکہ جس صنف پر خامہ فرسائی فرماتے اُس میں کمال فن کا اظہار فرماتے تھے۔ چنانچہ اس موقعہ پر موصوف نے استادانہ کمالات کا حق ادا کر دیا، اس لئے کہ اس میں واقعہ نگاری جذبات کی عکاسی، مرثیہ اور اشارات علمی سبھی مقامات آگئے ہیں اور ہر مقام پر آپ نے فن شاعری کا کمال دکھایا ہے۔ اور پھر حضرت اقدس واعلیٰ کی تحریر کے الفاظ پر جو تبصرہ آپ نے فرمایا ہے اُس میں وہ وہ نکات پیدا کئے ہیں جو ایک ماہر فن اور وسیع النظر عالم ہی کے ذہن میں آ سکتے ہیں۔ اس پر فن شعر کے تمام لوازم کا لحاظ اور صنائع و بدائع لفظی و معنوی کی چاشنی لذت مطالعہ و آموزش میں اضافہ کرتی ہیں۔ حضرت اقدس واعلیٰ نے اپنی مختصر تحریر میں

نقل

احسن بلگرامی نجم مارہروی اُستاد شعبہ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میری فارسی نثر کا اُردو میں تم نے جو منظوم ترجمہ کیا ہے جس کو کہ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب وائس چانسلر مُسلم یونیورسٹی نے میرے ہاں بھیجا تھا بتوسط ہوش بلگرامی جس کا نام شاہکار عثمانی ہے میں نے بغور دیکھا اور تمہاری محنت کی داد دیتا ہوں یہ رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ صفحۂ عالم پر (جہاں تک کہ علمی دنیا کا تعلق ہے) باقی رہے گی۔ آصف سابع

۲۳ ربیع الثانی ۵۶ھ

Private.

HYDERABAD DECCAN.

3rd July, 1937.

Copy.

My old friend Dr. Zia Uddin Saheb,

I was very pleased to read the little book under the heading ''Shahkar Usmani'' which you sent me through Hosh Bilgrami and greatly appreciate the trouble you have taken in asking Ahsan Marehravi to carry out your wishes, in the way, he has done it which, in my opinion, is really worth reading.

Hope you are well.

Yours sincerely,

M. OSMAN ALI KHAN.

کلام پاک کے تحفہ کی عظمت، شاہزادہ معصوم کی اندوہناک وفات کا ماتم، ناآشنائے فن طبیب کی ندمت حکم قرآنی کی بلاغت اور دورِ حاضرہ کی علمی اور فنی کم مایئگی کا مرثیہ پیش کر کے گویا دریا کو کوزہ میں بند فرما دیا ہے اور حضرت احسن نے اس علمی شاہ کار پر تبصرہ فرماتے ہوئے جو دور رس اشارات کئے ہیں اُن سے اس تحریر کی عظمت اور قدر و قیمت عام فہم اور دلپذیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر آپ علوم فارسیہ کی کساد بازاری کا مرثیہ ان الفاظ میں پڑھتے ہیں۔

اس زمانہ میں جب کہ حافظ کی — مئے شیراز کی دوکان داری
خال خال آتی ہی جہان میں نظر — بلکہ خالی ہیں میکدے اکثر
نہ رواں ہے وہ نہر رکن آباد — نہ وہ گلگشت اور مصلیٰ یاد

وہ دل آویزیاں ہوئیں برباد — چٹکیاں لے رہی ہے جن کی یاد
نہ ہے افراسیاب اب موجود — نہ کہیں ہے تہمتنوں کا وجود
عجمی وہ زبان، جو صدیوں تک — رہی خالص بغیر شبہہ و شک
تھا منیژہ کا جس میں نعرۂ عشق — جس پہ نازاں تھے اصفہان و دمشق
جس میں تاثیر تھی وہ بات کہاں — وہ حکایات و واردات کہاں
جس پہ کرتا تھا ناز فردوسی — جس سے تھا خوش طراز فردوسی
وہ زبان فصیح اب ہے کہاں — وہ بیان ملیح اب ہے کہاں

پھر حضرت اقدس واعلےٰ کے کمال فن تحریر نظم و نثر کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

دیکھئے نظم کو تو ہو باور — اک لڑی میں پروئے ہیں گوہر
نثر کے دیکھنے کا ہو جو خیال — تو جواہر سے پائیں مالا مال

بر محل انتخاب الفاظ کی | جس میں قطعاً نہیں ہے نفاظی
زور بھی ہے بیان میں ایسا | ہو سمندر میں جزر و مد جیسا
بہ رہا ہے نزاکتوں کے ساتھ | اور پھر سو لطافتوں کے ساتھ
ہر بیان بر زبان غالب ہے | چشمۂ معنی و مطالب ہے
عربی کیا ہے فارسی کیا ہے | ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

ساری نظم میں شاعرانہ کمالات اور نکات اتنے ہیں کہ ان سب کی تفصیل بہت طویل ہو جائیگی لیکن ان میں سے بعض باتیں ایسی ہیں جو اس مختصر مضمون میں بھی بیان کئے بغیر نہیں چھوڑی جاسکتی ہیں مثلاً حضرت اقدس واعلیٰ کی فارسی عبارتوں کو جہاں نظم کیا گیا ہے وہاں الفاظ، انداز بیان اور معانی و مطالب کی اس طرح حفاظت کیگئی ہے جو معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس واعلیٰ نے جوبلی پویلین میں اس نسخہ کو محفوظ کرنیکا خیال القا ہونے کا واقعہ یوں بیان فرمایا ہے کہ

درقلب من از غیب این القا شد

اسی کو حضرت احسن نے ایک ہی مصرعہ میں یوں بیان کر دیا ہے ؏

"کہ بقلم زغیب القا شد"

اسی طرح اس فیض جاریہ کی تشریح میں حضرت اقدس واعلیٰ فرماتے ہیں کہ

"کہ یک طرف از فیض شرکت آن مملکت حیدرآباد ہمیشہ از بلائے ارضی وسمادی محفوظ ومصئون ماند"

حضرت احسن نے اس مضمون کو ایک ہی شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

"یک طرف از فیض شرکت آن | باد ایں مملکت بحفظ وامان"

غرضکہ جس پہلو سے حضرت احسن کی اس نظم پر نظر ڈالی جائے یہ شاعری اور قدرت بیان اور ادائے مطالب و معانی کا ایک بے مثل شاہکار ثابت ہوگی اور جس قدر اس کے نکات پر غور کیا جائے اس کی خوبیاں اور روشن ہوتی جائیں گی۔

منتخب داغ پر تبصرہ

از جناب مرزا محمد سعید دہلوی

احسن مارہروی مرحوم کے نام اور ان کے ادبی کاموں سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ ان کے انتقال کو ابھی پورا ایک سال بھی نہیں گذرا۔ مرنے سے پہلے وہ داغ دہلوی کے کلام کا ایک منتخب مجموعہ ترتیب دے چکے تھے جس کو اُن کے صاحبزادے سید احسن صاحب مارہروی نے "منتخب داغ" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس انتخاب کے علاوہ احسن مرحوم نے داغ کے خطوط کا بھی ایک مجموعہ تیار کر لیا تھا اور "منتخب داغ" کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ بھی بہت جلد شائع ہو جائے گا۔

فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی اردو شاعروں کے گروہ میں نہ صرف اپنے کلام کی خوبی کی وجہ سے بہت ممتاز نظر آتے ہیں بلکہ ان کی زندگی بھی کئی حیثیت سے ان کے ہمسر شعرا کے لئے باعث رشک ہو سکتی تھی۔ اول تو ان کے کلام کو جو شہرت اور مقبولیت خاص و عام کی نگاہ میں ان کی اپنی زندگی ہی میں حاصل ہو گئی تھی وہ ان کے زمانے میں یا ان سے پہلے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے بعد اس شہرت اور مقبولیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ سچ پوچھا جائے تو اس میں کچھ کمی ہی ہو گئی ہے لیکن پھر بھی اگر ہم اس بارے میں ان کا مقابلہ مرزا غالب سے کریں جن کی شہرت اب روز افزوں ترقی کر رہی ہے لیکن جن کا کلام ان کی زندگی میں عوام کا تو ذکر ہی کیا خواص میں سے بھی بہت کم کو پسند آتا تھا تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ غالب شاعر کی حیثیت سے داغ سے کتنے بھی زیادہ بلند مرتبہ ہوں لیکن انسان کی حیثیت سے داغ ان سے بہت زیادہ خوش قسمت تھے۔ دوسری بات جو ہمیں داغ کی زندگی میں ممتاز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے اکثر اساتذہ افلاس اور تنگدستی میں مبتلا رہے۔ لیکن داغ کو دنیوی ثروت اور خوش حالی کا بہت کافی حصہ مل گیا اور یہ ثروت اور خوش حالی کسی خارجی یا اتفاقی اسباب کا نتیجہ نہ تھی بلکہ شاعری ہی کی بدولت ان کو حاصل ہوئی تھی لیکن جس چیز کو میں ان کی خوش بختی کی سب سے بڑی دلیل خیال کرتا ہوں وہ

یہ ہے کہ ان کو شاگرد بہت اچھے ملے۔ چونکہ ہمارے خیالات شعر و شاعری کی حقیقت کے متعلق اب دور قسم کے ہو گئے ہیں ہمیں شعرا میں استادی شاگردی کا سلسلہ کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن داغ کے زمانے میں یہ ایک عام رسم تھی کہ ہر ایک نیا شاعر کسی پرانے اور تجربہ کار شاعر کو اپنا استاد قرار دیتا تھا اور اپنے کلام میں اس سے اصلاح لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسکو کسی اصلاح کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی اور اگر اس میں شاعری کی فطری اہلیت ہوتی تھی تو وہ خود استاد کا درجہ حاصل کر لیتا تھا چنانچہ داغ کے کئی شاگرد ایسے ہیں جو بعد میں خود استاد سخن تسلیم کئے گئے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست میں سب سے اوپر علامہ اقبال مرحوم کا نام ہے بعض لوگوں نے اس نسبت سے انکار کیا ہے شاید اس خیال سے کہ ان کی رائے میں اقبال کو داغ کا شاگرد کہنا اقبال کی توہین ہے۔ لیکن اگر آپ نے اقبال کے "بانگ درا" کے دیباچہ کو مطالعہ کیا ہے تو آپ سمجھ لیں گے کہ ان لوگوں کا انکار صحیح واقعات سے لاعلمی پر مبنی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال مرحوم کی شاعری کا اسلوب داغ کے رنگ سخن سے اتنا مختلف تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ادبی رابطہ تصور کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبال کو اوائل عمر میں جب شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے اس زمانے کی رسم کے مطابق کوئی استاد تلاش کرنا ضروری خیال کیا۔ ان کی نظر انتخاب داغ پر پڑی اور اپنی چند ابتدائی غزلیں داغ کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے بھیجیں۔ اگر آپ میری شہادت پر اعتماد کر سکتے ہیں (اور میں اپنے حافظہ پر) تو مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اقبال داغ کو پرانے رنگ کی اردو شاعری کے ان پانچ چھ اساتذہ میں شمار کرتے تھے جو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ بلند پایہ تھے اور جن سے خود انھوں نے بھی کم و بیش استفادہ کیا تھا۔ اس مختصر گروہ میں جہاں تک مجھے یاد ہے داغ کے علاوہ میر تقی میر انیس اور مرزا غالب بھی شامل تھے۔ داغ کے شعروں کی بندش اور فصاحت زبان کو وہ ان کے کلام کا خاص وصف خیال کرتے تھے۔ جب داغ کا انتقال ہوا تو اقبال نے ایک نظم لکھ کر خراج تحسین اور حق شاگردی ادا کیا یہ نظم بانگ درا میں درج ہے اس میں اقبال نے نہ صرف اس جذبہ اور اثر کا اظہار کیا ہے جو ان کے قلب پر داغ کی وفات سے پیدا ہوا تھا بلکہ داغ کے کلام پر ایک نہایت لطیف پیرایہ میں تنقید بھی کر دی

ہے جس سے سمجھنے والے اس کلام کی خصوصیات اور اس کے حدود کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ میں اس نظم کے چند شعر آپ کو سنانے کی اجازت چاہتا ہوں نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ :۔

عظمت غالب ہے اک مدت سے پیوند زمیں ۔۔۔ مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر ۔۔۔ چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے ۔۔۔ شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

(ان اشعار میں جن شاعروں کا ذکر آیا ہے ان میں سے غالب کو تو سب جانتے ہیں۔ میر مہدی مجروح دہلی کے آخری دور کے ایک ممتاز شاعر تھے اور امیر منشی امیر احمد مینائی لکھنوی ہیں جو داغ کے دوست اور ہمعصر تھے۔ فن شعر میں لکھنو والے ان کو داغ کا حریف تصور کرتے تھے) اس کے بعد چند اور شعر ہیں جن میں اقبال نے اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کیا ہے اور پھر وہ اشعار ہیں جن کو میں داغ کی شاعری کی صحیح تنقید خیال کرتا ہوں اور جو آپ کی خاص توجہ کے مستحق ہیں :۔

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخی طرز بیاں ۔۔۔ آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے ۔۔۔ لیلی معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھیگا سکوت گل کا راز ۔۔۔ کون سمجھے گا چمن میں نالہ بلبل کا راز
تھی حقیقت سے نہ غفلت عشق کی پرواز میں ۔۔۔ آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

ان چار شعروں میں اقبال نے داغ کے کلام کے سب محاسن شاعرانہ اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں طرز بیان کے لحاظ سے شوخی اور بانکپن داغ کے کلام کا خاص وصف تھا۔ اور اس وصف کو انہوں نے اپنی جوانی سے لیکر بڑھاپے تک قائم رکھا۔ مضمون کے اعتبار سے قلبی واردات۔ معاملات اور محاکات۔ ان کی شاعری کا بیشتر سرمایہ تھے۔ اور جو تمنائیں اور آرزوئیں خاص لمحوں میں ہر انسان کے دل میں ابھرتی ہیں ان کو وہ ایسے دلکش انداز سے بیان کرتے تھے کہ ہر شخص کو اپنے جذبات کی ترجمانی کا بہترین پیرایہ مل جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ داغ کے اشعار مختلف موقعوں پر روزمرہ کی گفتگو اور خط و کتابت میں جس کثرت سے نقل کئے جاتے ہیں اتنے کسی اور شاعر کے شاید ہی کئے جاتے ہوں گے۔ ان خوبیوں کی تشریح کے ساتھ

اقبال نے ایک ہلکا سا کنایہ اس امر کی جانب بھی کر دیا ہے کہ حسن و عشق کے حرف و حکایت بیان کرنے میں داغ بعض دفعہ عریانی کی حد تک پہونچ جاتے ہیں۔ آخری دو شعروں سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ داغ کی شاعری اگرچہ ظاہری صورت میں گل و بلبل کے رسمی اور فرسودہ استعارات تک محدود تھی لیکن اس میں حقیقت اور دل آویزی کی ایک ایسی تمثیل نظر آتی ہے جو اردو غزل گوئی میں بہت کمیاب ہے اب اس سے آگے کے شعر سنئے:۔

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخی دوران کے نقشے کھینچکر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

اس چمن میں ہونگے پیدا بلبل شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہونگے صاحب اعجاز بھی

اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بتخانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائینگی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہو نگی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

ان چند شعروں میں اقبال نے داغ کی شاعری کی قدر و قیمت اور اردو ادبیات میں انکی وقعت کا عمومی حیثیت سے موازنہ کیا ہے اردو شاعری کا میدان روز بروز زیادہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ غزل کی اس "تنگنائے" میں مقید نہیں رہی جس کی تنگی کے غالب شاکی تھے۔ داغ ہی کے زمانے میں ان کے بعض ہم عصر شاعروں مثلاً حالی آزاد وغیرہ نے غزل گوئی کی قدیم روش کو ترک کرکے شاعری کے لئے نئی راہیں تلاش کر لی تھیں اور اس زمانے کے نوجوان جن میں اقبال سب سے آگے تھے ان نئی راہوں سے گذر کر اردو نظم کے لئے کسی نئی زمین اور نئے آسمان کا پتہ معلوم کرنے کی سعی کر رہے تھے اگرچہ داغ نے آخر وقت تک پرانی طرز کی غزل گوئی کے میدان سے باہر قدم نہیں نکالا۔ لیکن اپنی حسن پرستی اور رنگینی کے ذوق سے اس میدان میں ایسے بیل بوٹے لگائے کہ وہ ایک دلفریب گلزار بن گیا۔ اقبال کے اشعار کا یہی مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ حسن و عشق کے معاملات کا موثر بیان جو غزل کا قدیم اور اصلی نشا تھا داغ کے کلام میں کمال کو پہونچ گیا اور چونکہ اس کے بعد وہ ماحول ہی بدل گیا جس میں اس طرز کی غزل نے تربیت پائی تھی اس لئے امید نہیں کہ آئندہ زمانے میں داغ کے پایہ کا کوئی غزل گو پیدا ہو سکے اس خاص صفت میں کمال رکھنے کے باوجود داغ کی

سب غزلیں اعلیٰ پایہ کی نہیں ہوتیں اور شاید ان کی اچھی غزلوں میں بھی بہت کم ایسی ہوں گی جن کے سب شعر اچھے کہے جاسکیں وہ ایک پرگو شاعر تھے اور ان کا پورا کلام چار ضخیم دیوانوں میں مرتب ہوا ہے اس کلام کی شہرت کی بقا کے لئے ایک اچھے انتخاب کی بہت ضرورت تھی۔ اس کو بھی داغ کی خوش بختی خیال کرنا چاہئے کہ ان کے ایک شاگرد رشید کو اس ضرورت کے پورا کرنے کی توفیق اور مہلت مل گئی۔ احسن مارہروی مرحوم کے سوا دو ایک اور آدمیوں نے بھی داغ کے کلام کا انتخاب کیا ہے لیکن میری دانست میں "منتخب داغ" پہلا انتخاب ہے جس سے داغ کی شاعری کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ احسن مرحوم کو داغ کی صحبت میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بہت مدت تک ایک رسالہ نکالتے رہے جس کا نام ہی "فصیح الملک" تھا اور جس میں زیادہ تر داغ اور ان کے شاگردوں ہی کا کلام شائع ہوتا تھا۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کے سوانح زندگی کو ترتیب دینے کی خدمت انہوں ہی نے اپنے ذمہ لی تھی۔ غرضیکہ احسن نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے استاد کے نام اور کلام کو چمکانے کے لئے وقف کر دیا تھا اور داغ کی شاعری کے مختلف گوشوں سے جس طرح وہ آگاہ تھے کسی اور شخص کا ہونا بہت دشوار ہے اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کے ذوق سخن کا اندازہ اس تحریر سے ہو سکتا ہے جو ان کے حالات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے متعلق ان کے بیٹے نے قلم بند کر کے کتاب میں بطور تمہید شامل کر دی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر ایک شاعر شعر کی تنقید کی بھی اہلیت رکھتا ہو بلکہ اکثر اس کے خلاف دیکھنے اور سننے میں آیا ہے لیکن احسن مرحوم شاعر بھی تھے اور نقاد بھی جس کے ثبوت میں اُن کی "تاریخ نثر اردو" اور بہت سے تنقیدی مقالات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اسی کتاب میں چند اوراق موجود ہیں۔ جن میں احسن مرحوم نے داغ کی زندگی ان کے ذاتی خصائل اور اُن کے کلام پر ایک مختصر مگر بہت پر معنی تبصرہ کیا ہے۔ ان اوراق سے بھی احسن کی ادبی تنقید کا کچھ موازنہ کیا جا سکتا ہے انہوں نے اپنے انتخاب کو دو اصول پر مبنی کیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں صرف وہ اشعار جمع کئے ہیں جن میں داغ نے فارسی اضافت اور عطف کا استعمال نہیں کیا۔ داغ کی شاعری کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ غزل کی زبان جہاں تک ممکن ہو سادہ بنایا جائے۔ بعض دفعہ ان کی سادگی سادہ لوحی کی حد تک پہونچ جاتی تھی اور لوگ ان کے ایسے شعروں پر ہنستے تھے کہ ؎ ہمارا دل ہمارا دل کبھی تھا + تری صورت تری صورت کبھی تھی۔ لیکن اکثر ان کے شعروں کی

سادگی ان کی دلکشی اور تاثیر کو بڑھا دیتی ہے احسن نے تخمینہ کیا ہے کہ داغ کے ایک تہائی سے زیادہ ایسے اشعار ہیں جن میں فارسی عطف و اضافت کا استعمال نہیں ہوا۔ اس زمانے میں اردو کے اسلوب تحریر کو سادہ بنانے کا بہت چرچا سننے میں آتا ہے داغ نے اس بارے میں جو کوشش کی ہے وہ آجکل خاص قدر و منزلت کی مستحق ہونی چاہیئے انتخاب کے دوسرے حصے میں کسی خاص اسلوب بیان کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ جس غزل میں جو شعر اچھا معلوم ہوا اسکو درج کر دیا گیا ہے۔ انتخاب میں اکثر ہر ایک غزل کے پانچ سات شعر اور بعض غزلوں کے اس سے بھی زیادہ اشعار آ گئے ہیں ایسی بہت کم غزلیں ہیں جن کے صرف دو ایک شعر چنے گئے ہوں۔ غزلوں کی ترتیب ردیف وار ہے جیسی عموماً شعرا کے دیوانوں میں ہوتی ہے۔ داغ کے چار دیوان ہیں۔ انتخاب میں ہر ایک غزل کے متعلق صراحت کر دی گئی ہے کہ وہ کون سے دیوان میں مل سکتی ہے چونکہ یہ چاروں دیوان داغ کی شاعرانہ زندگی کے مختلف زمانوں میں ترتیب دیئے گئے تھے اس لئے ان کی غزل گوئی کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان سب سے کم و بیش واقف ہونا لازمی ہے۔ اس قسم کی واقفیت بقدر ضرورت احسن کے "منتخب داغ" کے ذریعہ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

تمام شائقین علم و ادب کے لئے بصد مسرت یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ حضرت مولانا احسن مارہروی علیہ الرحمۃ کے علمی۔ ادبی اور اخلاقی ہر قسم کے مکتوبات کا قابل قدر مجموعہ عنقریب کتابی صورت میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آنے والا ہے لہذا تمام حضرات متعلقین حضرت مولانا احسن صاحب مارہروی علیہ الرحمۃ سے درخواست ہے کہ جن حضرات کے پاس مولانا مرحوم مغفور کے مکتوبات محفوظ ہوں وہ عاریتاً چند روز کے لئے ذیل کے پتے پر بذریعہ ڈاک (بیرنگ) ارسال فرما کر ممنون کرم فرمائیں اور ثواب دارین حاصل کریں خطوط کی واپسی بہت جلد اور محفوظ طریقہ سے ہوگی کسی صاحب کو کسی قسم کا وسوسہ یا خیال دل میں نہ لانا چاہیئے۔ اگر خدانخواستہ کسی صاحب کو اصل خطوط مرحمت فرمانے میں تامل ہو تو وہ مکمل اور خوشخط نقل ارسال فرما کر رہون منت فرمائیں یا کم از کم خطوط کی موجودگی سے مطلع فرمائیں تاکہ بسبیل مناسب ان سے خطوط کی نقول حاصل کی جاسکیں۔

نیازمند

صغیر جلال آبادی

بمکان داروغہ ولی محمد مرحوم

میرٹھ روڈ۔ مقام مظفرنگر۔ (یو۔پی)

اعلان

ادارۂ علی گڑھ میگزین نے طے کیا ہے کہ سال رواں کے بہترین مضامین نثر و نظم پر جو میگزین میں شائع ہوں مضامین کی تعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسب ذیل انعامات دئے جائیں۔ اس مقابلہ میں صرف طالبات و طلبائے مسلم یونیورسٹی شریک ہو سکیں گے۔

انعامات

نثر۔

انٹرمیڈیٹ کلاس کے طلبا کے لئے

(۱) انعام اول۔ دس روپیہ

(۲) انعام دوم۔ سات روپیہ

ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ کلاس کے طلبا کے لئے

(۳) انعام اول بارہ روپیہ

(۴) انعام دوم آٹھ روپیہ

نظم

(۵) ایک انعام۔ دس روپیہ

طالبات مسلم یونیورسٹی کے لئے

(۶) ایک انعام۔ دس روپیہ

ایڈیٹر